ہمدرد
نونہال

بجلی اور برقی سرکٹ

اس خاکے میں ایک برقی لیمپ کا سرکٹ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہمارے گھر میں جو تار استعمال ہوتے ہیں وہ اصل میں ان تاروں کا ایک جزو ہیں جو سینکڑوں میل دور سے ہمارے لیے بجلی لاتے ہیں۔

خاکے (الف) میں کانچ کا وہ حاجز گولا دکھایا گیا ہے جو تم نے اونچے اونچے کھمبوں پر لگا دیکھا ہوگا۔ وہ کرنٹ کو کھمبے میں نہیں اترنے دیتا۔ اس گولے پر پانی نہیں ٹھہر سکتا۔ پانی اور نمی بجلی کے اچھے موصل ہیں۔ برقی آلات کو اُن سے بچانا چاہیے۔

خاکے (ب) میں مین فیوز دکھایا گیا ہے۔ یہ اصل میں ایک باریک تار ہوتا ہے

(سرورق ص۳ پر بھی دیکھو)
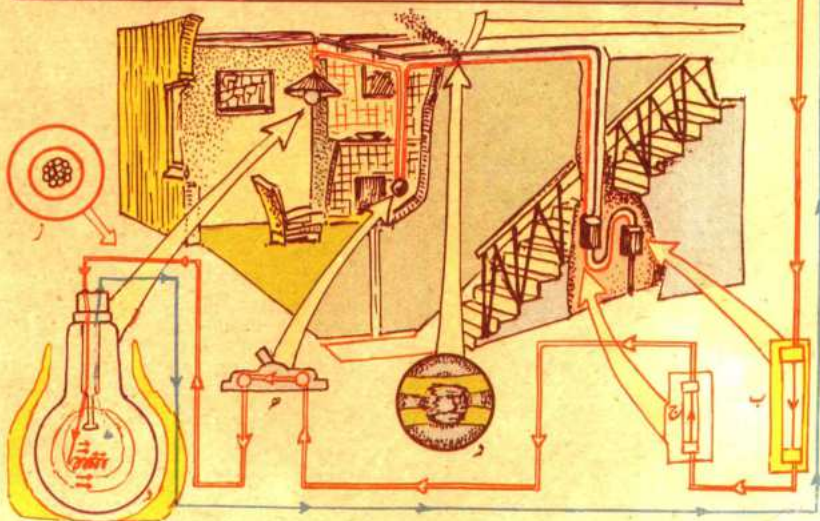
مدیرِ اعلا: حکیم محمد سعید

مدیرِ معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۱ جلد ۱۲

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۵

جاگو، جگاؤ

علم، صحت اور اخلاق یہ تین دولتیں ایسی ہیں، جو انسان کے پاس ہوں تو اسے پھر کسی دولت کی ضرورت نہیں رہتی۔ دین و دنیا کی تمام دولتیں اور نعمتیں ان تین چیزوں سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ وہ انسان بڑے اچھے ہیں جن کو یہ تینوں چیزیں حاصل ہیں۔ ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرو باقی چیزیں تمھیں خود مل جائیں گی۔

حکیم محمد سعید

قیمت :- ایک رسالہ : ۷۵ پیسے — سالانہ : آٹھ رُپے

جھولا

حامد اللہ افسر
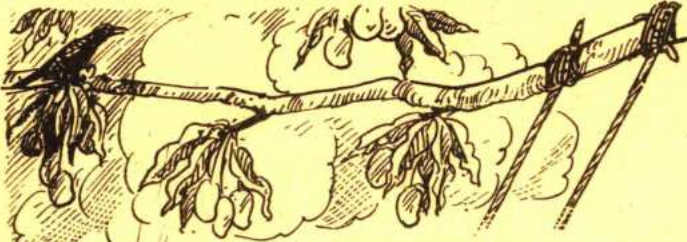
جب پینگ بڑے ہر سو لیں گے آکاش کو جا کر چھو لیں گے
جب بیلا، ساونی پھولیں گے غم سارے جہاں کے بھولیں گے
سب مل کر جھولا جھولیں گے

جب بادل گھِر کر آئیں گے اور سارے فلک پر چھائیں گے
ہم کیا کیا پینگ بڑھائیں گے سب مل کر ساون گائیں گے
سب مل کر جھولا جھولیں گے

جب بادل چھم چھم برسیں گے اور صبح سے پیہم برسیں گے
ہر لحظہ ہر دم برسیں گے پر باغ میں کم کم برسیں گے
سب مل کر جھولا جھولیں گے

جب کوئل کوک لگائے گی وہ ہم کو باغ میں پائے گی
اِس پیڑ سے اُس پر جائے گی کوکو کا شور مچائے گی
سب مل کر جھولا جھولیں گے

کوئی ٹیڑھا میڑھا بیٹھے گا کوئی جھولے پر سے پھسلے گا
کوئی گر کے زمیں پر اٹھے گا کوئی دیکھ کے یہ سب ہنس دے گا
سب مل کر جھولا جھولیں گے

کوئی آم اُچک کر توڑے گا کوئی شاخ پکڑ کر موڑے گا
کوئی ہاتھ کسی کا مروڑے گا کوئی جھولے کی رسّی چھوڑے گا
سب مل کر جھولا جھولیں گے

بجلی اور برقی سرکٹ

سرورق ۲ و ۳ پر جو تصویریں تم نے دیکھی ہیں، وہ اس مضمون کو سمجھنے میں مدد دیں گی اور اس مضمون کو پڑھ کر پھر اُن تصویروں کو دیکھوگے تو وہ زیادہ دل چسپ اور مفید معلوم ہوں گی۔

برقی قوت سے سب واقف ہیں، کیوں کہ ہمیں اُس سے قدم قدم پر آرام پہنچتا ہے، لیکن اگر کوئی یہ پوچھے کہ بجلی اصل میں ہے کیا تو سائنس داں اِس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ برقی رَو کسی کو نظر نہیں آتی۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ تاروں پر دوڑتی ہے، لیکن بجلی تار پر جارہی ہو یا نہ جارہی ہو، تار کی ظاہری شکل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور نہ تار کا وزن کم زیادہ ہوتا ہے۔

بجلی جب حرکت میں آجاتی ہے تو برقی رَو کہلاتی ہے۔ یہ کام نہایت مختصر ذرّے انجام دیتے ہیں، جو الیکٹرون کہلاتے ہیں۔ ان ننھے ذرّات پر تھوڑا سا منفی برقی بار موجود ہوتا ہے۔ یہ ذرّے ایٹم سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں اور انھیں کسی طرح دیکھا نہیں جاسکتا۔ ہر ایٹم کا ایک مرکزی حصّہ ہوتا ہے، جس کے چاروں طرف الیکٹرون تیزی سے گھومتے رہتے ہیں۔ ان کا منفی برقی چارج ختم کردینے کے لیے ہر ایٹم کے مرکزے پر کچھ مثبت ذرّات موجود ہوتے ہیں، جو پروٹون کہلاتے ہیں۔ مثبت اور منفی چارج ایک دوسرے کے برابر ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو بے اثر کردیتے ہیں، لہٰذا کوئی بھی ایٹم اپنی اصلی حالت میں نہ مثبت طور پر چارج ہوتا ہے اور نہ منفی طور پر۔

بجلی بعض چیزوں میں سے آسانی سے گزر جاتی ہے اور بعض میں سے نہیں گزرتی یا مشکل سے گزرتی ہے۔ پہلی قسم کی چیزیں بجلی کا موصل کہلاتی ہیں۔ دھاتیں عام طور پر بجلی کی اچھی موصل ہوتی ہیں۔ تانبا اور بھی اچھا رہتا ہے۔ اس کے کچھ الیکٹرون ذرا ڈھیلے ہوتے ہیں، وہ آسانی سے ایک ایٹم سے دوسرے ایٹم پر کود جاتے ہیں۔ ان کی اس حرکت کا نام ہی برقی رَو ہے۔ تاریں سے بجلی گزارنے کی ذمّے داری اِن الیکٹرونوں پر ہی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ الیکٹرون مختلف ایٹموں کے درمیان کیوں حرکت کرتے ہیں؟ بجلی کا ایک کلیہ یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے چارج (خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی) ایک دوسرے کو رد یا دفع کرتے ہیں، لیکن مخالف قسم کے چارج (ایک مثبت اور دوسرا منفی) ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ چوں کہ الیکٹرونوں پر منفی چارج موجود ہوتا ہے، اس لیے انھیں منفی ایٹم رد کر دیتے ہیں اور مثبت چارج والے ایٹم انھیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

اِس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چارے الیکٹرون اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہیں، حتیٰ کہ اس میں کوئی ایٹم ایسا بھی مل جاتا ہے، جس پر الیکٹرون کم ہوتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر کسی ایٹم سے کوئی الیکٹرون خارج ہو جائے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا الیکٹرون لے لے، لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے، جب تار کے اندر کوئی قوت موجود ہو یا باہر سے آجائے۔ یہ قوت ان آوارہ الیکٹرونوں کو سیدھی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ یہ قوت برقی دباؤ کے فرق سے پیدا کی جاتی ہے، جسے ہم "وولٹیج" کہتے ہیں۔ یہ فرق اس تار کے دونوں سروں پر پیدا کیا جاتا ہے، جس میں سے برقی رو گزارنی ہوتی ہے۔ اِس مقصد کے لیے ہم کوئی بیٹری یا جنریٹر (ڈائی نیمو) استعمال کرتے ہیں۔ برقی دباؤ کا یہ فرق اُن ڈھیلے الیکٹرونوں کو پہلے ایٹم سے علیحدہ کر کے دوسرے پر اور دوسرے ایٹم سے تیسرے ایٹم پر ڈال دیتا ہے۔ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

اِس سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنی چاہییں۔ اوّل یہ کہ تار کے ایک سرے سے جو الیکٹرون شروع ہوتے ہیں، وہی دوسرے سرے تک نہیں پہنچتے، دوسرے ہم آسانی کے لیے ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ برقی رَو بیٹری کے مثبت سرے سے منفی سرے کی طرف چلتی ہے، لیکن حقیقت میں برقی رو منفی سرے سے مثبت کی طرف جاتی ہے۔ وجہ ظاہر ہے الیکٹرون منفی چارج رکھتے ہیں، اِس لیے وہ بیٹری کے منفی سرے پر ہی ہونے چاہییں۔ مثبت سے منفی کی طرف کا یہ تصوّر قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے، جب سائنس داں بجلی کو اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے۔

برقی رو اسی وقت چل سکتی ہے، جب اس کا راستہ مکمل ہو جائے۔ اسی کو سرکٹ کہتے ہیں۔ برقی رو جس جگہ سے چلتی ہے، وہیں واپس آجاتی ہے۔ اِس مقصد کے لیے عام طور سے تانبے کے تار استعمال کیے جاتے ہیں، کیوں کہ یہ دھات بجلی کی بڑی اچھی موصل ہے اور سستی بھی ہے۔ اس میں آزاد الیکٹرون کافی تعداد میں موجود ہوتے ہیں، جو کرنٹ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں مدد

دیتے ہیں۔

چاندی تانبے سے بھی بہتر موصل ہے، لیکن اس کے تار بہت مہنگے پڑیں گے ـــــ جن چیزوں میں سے بجلی نہیں گزرتی، انھیں حاجز کہتے ہیں، مثلاً ربر اور پلاسٹک۔ حاجز کے ایٹموں کے ساتھ کوئی الیکٹرون ایسے نہیں ہوتے، جو آسانی سے علیحدہ ہوجائیں۔ بجلی کے تاروں پر حفاظتی غلاف چڑھانے کے لیے حاجز چیز استعمال کی جاتی ہے۔ اگر بجلی کے تار آپس میں مل جائیں تو فیوز اُڑ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ الیکٹرون اپنا راستہ پورا کرنے کے بجائے تیزی سے منفی تار سے مثبت پر کودنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس شورٹ سرکٹ سے عمارتوں میں آگ بھی لگ جاتی ہے۔ بجلی کی اِحتیاط ضروری ہے۔ پرانے تاروں کو تبدیل کردینا چاہیے۔

سرورق ۲ کے خاکے میں ایک گھر کا سرکٹ دکھایا گیا ہے۔ کرنٹ پاور ہاؤس کے جنریٹر سے روانہ ہوکر ایک بلب میں سے گزر رہی ہے۔ وہاں سے وہ جنریٹر میں واپس چلی جاتی ہے۔ عام طور سے جنریٹر ہمارے گھر سے بہت دور ہوتا ہے۔ کرنٹ کو سب کے گھروں اور کارخانوں تک پہنچانے کے لیے اونچے کھمبے اور موٹے تار استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان تاروں پر ربر یا پلاسٹک نہیں چڑھا ہوتا، کیوں کہ وہ ہَوا میں ننگے رہتے ہیں اور ہَوا بھی حاجز ہے۔ تاروں کو کھمبوں سے مَس نہیں ہونے دیتے، ورنہ سَاری کرنٹ زمین میں اتر جائے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ کھمبوں پر چینی مٹی کے پیالے لگے ہوتے ہیں، جو بڑی اچھی حاجز ہوتی ہے۔ بعض شہروں میں بجلی کے تار زمین میں دبے ہوتے ہیں۔ وہ ننگے نہیں ہوتے، بلکہ ان پر ربر یا پلاسٹک کا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔

جب برقی رو ہمارے گھر میں داخل ہوتی ہے تو اسے ابتدائی فیوز سے گزرنا پڑتا ہے، جو مین فیوز (MAIN FUSE) کہلاتا ہے۔ فیوز کے لفظی معنی پگھلنے یا جل جانے کے ہیں۔ یہ تار ایسی دھات کا ہوتا ہے، جس میں سے بجلی آسانی سے گزر جاتی ہے، لیکن ملائم ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ گرمی بَرداشت نہیں کرسکتا۔ جیسے ہی مثبت و منفی تار کہیں ملتے ہیں یا تاروں پر حد سے زیادہ بوجھ پڑتا ہے تو یہ بہت زیادہ گرم ہوکر پگھل جاتا ہے اور برقی رو بند ہوجاتی ہے۔ ہمارے گھر کے مختلف کمروں اور برقی آلات میں جو کرنٹ آتی ہے، وہ اسی ابتدائی فیوز سے گزر کر آتی ہے۔ اگر ہم کوئی

غلطی کرتے ہیں تو یہ تار جل کر ہمیں مصیبت سے بچا لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بہت ممکن ہے گھر میں آگ ہی لگ جائے، اسی لیے کبھی کبھی اسے سیفٹی فیوز بھی کہتے ہیں۔ سرورق ۲ کی تصویر میں یہ فیوز C سے ظاہر کیا گیا ہے۔ وہاں سے کرنٹ ایک سوئچ یا بٹن سے گزر کر ایک بلب میں جا رہی ہے۔ بٹن دبانے سے کرنٹ بہنے لگتی ہے اور اوپر کرنے سے بند ہو جاتی ہے۔

اب شاید تم یہ پوچھو گے کہ بلب سے ہمیں روشنی کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اس کے اندر اصل میں ایک باریک تار ہوتا ہے، جسے فلامنٹ کہتے ہیں اور جو باہر سے نظر بھی آتا ہے۔ یہ تار ایسی دھات کا بنا ہوتا ہے کہ کرنٹ اس میں سے آسانی سے نہیں گزرتی۔ عام طور سے یہ تار ٹنگسٹن نامی دھات کا بنایا جاتا ہے اور بہت باریک ہوتا ہے۔

ٹنگسٹن کے الیکٹرون اپنے ایٹموں کے ساتھ سختی سے جکڑے ہوتے ہیں، اس لیے کرنٹ اس دھات میں آسانی سے نہیں گزرتی۔ اسی بات کو ہم یوں بھی کہتے ہیں کہ ٹنگسٹن کی مزاحمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جب وہ کرنٹ کو اپنے اندر سے نہیں گزرنے دیتا تو کرنٹ زور لگاتی ہے۔ جب تم کسی رکاوٹ کو پار کرتے ہو یا ہوا کی مخالف سمت میں سائیکل چلاتے ہو تو تمھیں پسینہ آ جاتا ہے۔ اسی طرح کرنٹ کے زور لگانے کی وجہ سے ٹنگسٹن کا یہ تار بہت گرم ہو جاتا ہے —— اتنا زیادہ گرم کہ اُس سے روشنی نکلنے لگتی ہے۔ یاد رکھو کہ تار جتنا باریک اور لمبا ہو گا، اتنی ہی زیادہ مزاحمت پیدا کرے گا، اور اس سے اتنی ہی زیادہ روشنی نکلے گی۔ تھوڑی جگہ میں زیادہ لمبا تار اسی وقت سما سکتا ہے، جب اُسے موڑ کر اس کا لچھا بنا دیا جائے۔

برقی رو بلب کے اس لچھے سے گزر کر فیوز میں واپس جاتی ہے اور وہاں سے جنریٹر تک واپس چلی جاتی ہے۔ واپس جانے کے لیے بھی وہی تار استعمال کیے جاتے ہیں، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے، خواہ وہ اونچے کھمبے پر ٹنگے ہوں یا زمین میں دبے ہوئے ہوں۔

سرورق ۳ کی شکل میں ایک ٹارچ دکھائی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا سرکٹ ہے، جس میں تار استعمال نہیں کیے گئے ہیں۔ پرانے قاعدے کے مطابق کرنٹ بیٹری کے مثبت سرے سے روانہ ہوتی ہے۔ ہماری اس ٹارچ میں کاربن کی ایک چھوٹی سی سلاخ مثبت ہے، جو ٹارچ کے بیچوں بیچ دکھائی گئی ہے —— کاربن دھات نہیں ہے۔ پھر بھی اس میں سے

کرنٹ آسانی سے گزر جاتی ہے ـــــ اس کے اوپر پیتل کی ایک چھوٹی سی ٹوپی چڑھی ہوتی ہے۔

ٹارچ کے اندر ہم ایک چھوٹی سی بیٹری استعمال کرتے ہیں، جس میں کیمیائی عمل جاری رہتا ہے۔ اس عمل کی وجہ سے کاربن پر الیکٹرونوں کی کمی پیدا ہو جاتی ہے، یعنی اس کا منفی چارج کم ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ مثبت طور پر چارج ہو جاتی ہے۔ اِس بیٹری کا بیرونی خول جست کا ہوتا ہے۔ کیمیائی عمل کی وجہ سے اس پر الیکٹرونوں کی کثرت ہو جاتی ہے، یعنی وہ منفی طور پر چارج ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو کہ مثبت و منفی کے اِس فرق کی وجہ سے برقی دباؤ پیدا ہوتا ہے، جو کرنٹ جاری کرنے کا سبب بنتا ہے۔

روشنی کے لیے ہم اِس بیٹری پر ایک چھوٹا سا بلب کھڑا کر دیتے ہیں، اس کے اندر بھی ایک فلامنٹ ہوتا ہے، جس کا ایک سرا پیتل کی اُس ٹوپی سے جڑ جاتا ہے، جو کاربن کے سرے پر لگی ہوتی ہے اور دوسرا سرا بالائی کٹوری سے متعلق ہو جاتا ہے، کیوں کہ بلب کا نچلا حصّہ پیتل کا ہوتا ہے، جس میں سے کرنٹ آسانی سے گزرتی ہے۔ کرنٹ کٹوری سے ہوتی ہوئی پیتل کی ایک پتری تک آجاتی ہے، جس سے وہ بٹن چپکا رہتا ہے، جسے تم باہر سے دبا کر ٹارچ روشن کرتے ہو۔

بٹن دباتے ہی پیتل کی یہ پتری نیچے دب جاتی ہے، سرکٹ پورا ہو جاتا ہے اور کرنٹ بلب سے گزر کر اُسے روشن کر دیتی ہے۔ سرکٹ مکمل کرنے کے لیے ٹارچ کی تلی میں پیتل یا تانبے کا ایک سپرنگ ہوتا ہے، جو دو کام دیتا ہے۔ اوّل تو وہ ٹارچ کے سیل، کو اوپر کی طرف دبائے رکھتا ہے اور دوسرے وہ ٹارچ کے بیرونی خول کو سیل یا بیٹری کے بیرونی جستی خول سے جوڑے رکھتا ہے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کسی بھی بلب یا دوسرے برقی آلے میں سے کرنٹ اس وقت تک نہیں گزر سکتی، جب تک برقی سرکٹ پورا نہ ہو جائے۔ جستی خول منفی اور کاربن مثبت رہتا ہے۔ خوب صورتی کے لیے اِس سیل پر ایک چکنا کاغذ چڑھا ہوتا ہے، جس پر بنانے والی کمپنی کا نام وغیرہ لکھا ہوتا ہے۔ بڑی ٹارچ میں ایک کے بجائے دو، تین یا اس سے زیادہ سیل استعمال کیے جاتے ہیں، جو اوپر نیچے ایک دوسرے سے جُڑے رہتے ہیں۔ اصول اُن کا بھی یہی ہے۔

پھوڑے پھنسی کا ایک علاج

مگر بہتر ہے **صافی** استعمال کریں

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان - کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

روزہ

حکیم نعیم الدین زبیری

تم نے روزہ ضرور رکھا ہوگا۔ اگر تم بہت چھوٹے ہو تو تم نے اپنے بڑوں کو روزہ رکھتے تو دیکھا ہی ہوگا۔ آج ہم یہ بتائیں گے کہ روزہ کیوں رکھا جاتا ہے اور اس سے کیا فائدہ ہے!

بہت سے کام ایسے ہیں، جن کے کرنے کو تمھارا جی چاہتا ہے، کیوں کہ ان سے تمھیں خوشی ہوتی ہے، ان میں کوئی لذت ہوتی ہے یا بعض کام تم ایسے بھی کرتے ہو، جن کے متعلق تم نہیں بتا سکتے کہ تم کو ان سے کیا فائدہ ہوگا۔ بہر حال جی چاہنے کی اسی حالت کو خواہش کہتے ہیں۔ اس خواہش میں نہ صرف چھوٹے بڑے، بلکہ تمام جان دار شریک ہیں۔ جانور میں کیوں کہ اس خواہش پر کوئی پابندی نہیں ہوتی، اِس لیے ہر خواہش پوری کرلیتا ہے۔ یہ بھی تم جانتے ہو کہ انسان اور حیوان میں جو چیز فرق پیدا کرتی ہے وہ عقل ہے۔ زیادہ آسان طریقے پر تم یوں کہہ سکتے ہو کہ انسان میں عقل ہوتی ہے اور جانور میں نہیں ہوتی، اس لیے انسان کو اپنی ہر خواہش پوری نہیں کرنی چاہیے۔ ایک مثال پر غور کرو! تم نے کمرے میں گیند اچھالی، اس سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد تمھیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ تمھاری یہ حرکت مناسب نہیں تھی۔ اب آئندہ جب تم گیند اٹھاؤ گے تو تمھاری عقل تم کو یہ بات یاد دلائے گی اور تم اس شرارت سے پرہیز کروگے۔ اب یہ بات واضح ہوگئی کہ عقل ان خواہشوں کو پورا کرنے سے روکتی ہے، جن میں کوئی نقصان ہوتا ہے۔ یہ بھی تم کو معلوم ہے کہ اللہ میاں نے انسان کو پیدا کرکے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ اسے بہت کچھ کرنے کی طاقت دی ہے، مگر اپنے احکام کے ذریعے بہت سی پابندیاں بھی لگادی ہیں۔ وہ آدمی، جسے خدا اور اس کے احکام پر ایمان نہیں ہوتا وہ ان پابندیوں کو توڑتا رہتا ہے، مگر یہ بات عقل کے خلاف ہے اور صحیح معنوں میں انسان بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی خواہش پوری کرنے سے قبل اس بات پر غور کرلیں کہ کہیں یہ نقصان نہیں پہنچائے گی۔ یہ بھی تم جانتے ہو کہ جن کاموں کا اللہ نے حکم دیا ہے، وہ اچھے اور فائدے کے ہیں اور جن کاموں سے خدا نے منع کیا، وہ بُرے اور نقصان دہ ہیں۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ انسان کے عقل مند ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ خدا کے احکام کی پابندی کرے۔

اسکول میں تمھارے ماسٹر صاحب نے بتایا ہوگا کہ صبح تھوڑی ورزش کرنے سے دن بھر طبیعت اچھی رہتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ورزش کرنے سے بدن میں خون کی رفتار بڑھ جاتی ہے، سانس تیزی سے آنے جانے لگتا ہے اور کچھ پسینہ بھی نکلتا ہے اور بدن سے خراب چیزیں سانس اور پسینے کے ذریعے خارج ہوجاتی ہیں اور خون کی حرکت بڑھ جانے کی وجہ سے بدن میں طاقت آتی ہے۔

رمضان کے روزوں کو بھی تم اسی طرح کی ایک

ورزش سمجھ لو۔ ان سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آدمی میں جو برائیاں ہوتی ہیں، وہ رمضان کے احکام کی پابندی سے آسانی سے نکل جاتی ہیں، چوں کہ روزے میں نیک کام زیادہ کیے جاتے ہیں تو اس سے ایمان محفوظ ہوتا ہے اور جو آدمی پابندی سے ہر سال تیس۳۰ دن کے روزے رکھتا ہے، اسے اپنی ساری زندگی میں اپنی بُری خواہشوں سے باز رہنے اور اچھی باتوں پر عمل کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔

روزہ انسان کو یہ سبق سکھاتا ہے کہ جن چیزوں کا خدا نے حکم دیا اُن کو ضرور کرنا چاہیے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے، اُن سے ضرور بچنا چاہیے۔

روزے میں یہی تو ہوتا ہے کہ سحری کا وقت ختم ہوجانے کے بعد سے سورج غروب ہونے تک چاہے بھوک لگے یا پیاس کچھ نہیں کھاتے پیتے۔ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ کھانے پینے میں کوئی بُرائی کی بات نہیں، مگر جب خدا منع کردے تو یہی کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے۔ چُناں چہ معلوم ہوا کہ خدا کے حکم کے خلاف کرنا ناجائز ہے۔ ایک ضروری بات یہ ذہن میں رکھو کہ روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے ہی کا نام نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ روزے کی حالت میں زیادہ سے زیادہ نیک کام کیے جائیں، بُرے کاموں اور بُری باتوں سے بچا جائے۔ کسی کی غیر موجودگی میں اس کی بُرائی کرنا غیبت یا چغلی کہلاتا ہے، خاص کر روزے میں اس سے بچنا چاہیے۔ ویسے بھی یہ بہت گناہ کا کام ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا، بڑوں کی نافرمانی کرنا، ایسی شرارتیں کرنا جن سے کسی کا نقصان ہو یا کسی کو تکلیف پہنچے روزے کی حالت میں بہت بُرا ہے۔

روزے کے بارے میں چند ضروری باتیں یاد رکھو۔ سحری کا وقت ختم ہونے سے سورج غروب ہوجانے تک خدا کی عبادت کی نیت سے کھانا پینا چھوڑنے کا نام روزہ ہے۔ سال میں ایک مہینہ رمضان میں عام مسلمانوں پر روزہ رکھنا فرض ہے۔ اگرچہ بچوں پر روزہ فرض نہیں، تم روزہ رکھ سکو بہتر ہے، جو شخص رمضان کے روزے کو فرض نہیں سمجھتا، وہ کافر ہے اور جو جان بوجھ کر بغیر عذر روزہ نہ رکھے وہ گناہ گار ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خدا کو خوش کرنے کے لیے رمضان میں روزہ رکھے، خدا اس کے سب گناہ معاف کردیتا ہے۔

روزہ رکھنے سے انسان میں خدا کا خوف اور پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے اور جسمانی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔ کھاتے پیتے لوگوں میں غریبوں کی بھوک کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جب رمضان کا چاند دکھائی دے تو روزے رکھنا شروع کرتے ہیں اور جب عید کا چاند نظر آجائے تو روزے رکھنا ختم کردیتے ہیں۔ روزہ رکھنے کے لیے سحر کے وقت کچھ کھانا سنّت ہے، مگر اتنا نہیں کھانا چاہیے کہ پیٹ خراب ہوجائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ روزہ بھی مکروہ ہوجاتا ہے یعنی اس کا ثواب کم ہوجاتا ہے۔

اِن باتوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے: جان بوجھ کر کھانا پینا، کلّی کرتے وقت بے خیالی سے حلق میں پانی چلا جانا، ناک میں دوا ڈالنا، زبردستی قے کرنا۔

بھولے سے اگر کوئی کچھ کھا پی لے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

سب سے خوب صورت محل

میرزا ادیب

سلطان محمود غزنوی کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ شاہی محل کے نیچے اپنے چند دوستوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اتنے میں کوئی چیز اٹھانے ذرا دور گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ان کا ایک ساتھی محل کی دیوار کی طرف اشارہ کرکے اپنے ہمجولی کو کچھ بتا رہا ہے۔ محمود کو دیکھتے ہی وہ خاموش ہوگیا اور اس طرح شکل بنالی، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ محمود نے اسے محل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے بولے، "کیا معاملہ ہے، مجھے بھی تو بتاؤ۔" دوست نے کہا، "یہ تمھارا شاہی محل ہے۔ ذرا اس کی دیوار تو دیکھو۔ کتنا بڑا دھبّہ پڑا ہے اس پر، کتنی بدنما دیوار دکھائی دے رہی ہے، ہمارے مکان کی دیواریں تو شفاف نظر آتی ہیں شیشے کی طرح۔"

محمود کو ان لفظوں سے بڑا دکھ ہوا۔ وہ اُس وقت خاموش رہے۔ شام ہوئی تو اُن کے والد سلطان سبکتگین محل میں آئے۔ محمود نے اُن کو سارا واقعہ سنا دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ بادشاہ اسی وقت اس گستاخ لڑکے کو طلب کرکے خوب سزا دیں گے، لیکن ہوا یہ کہ وہ بات سن کر صرف مسکرا دیے۔ کہا تو فقط اتنا، "واہ بیٹا!

اس میں بھلا بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ شاہی محل کی دیواریں بھی عام دیواروں جیسی ہی رہتی ہیں ان پر دھبّہ کیوں کر نہیں پڑ سکتا، جاؤ ان چیزوں کا خیال نہیں کیا کرتے۔"

رات جب محمود بستر پر لیٹے تو ان کی آنکھوں میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ طبیعت میں بے چینی تھی۔ ایک تو ان میں اس بات کا رنج تھا کہ ایک معمولی لڑکے نے شاہی محل کا مذاق اڑایا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ خود بادشاہ نے بھی اس کا بُرا نہیں مانا تھا اور لڑکے کو کوئی سزا نہیں دی تھی۔ سوچتے سوچتے ان کے دماغ میں ایک تجویز آگئی اور وہ بے فکر ہو کر سو گئے۔

کچھ مدّت گزر گئی۔ محمود اپنے ذہن میں سوچی ہوئی تجویز پر مزید غور کرتے رہے۔ آخر جب یہ تجویز پوری طرح پختہ ہوگئی تو وہ اپنے باپ کی خدمت میں پہنچے اور بولے، "بابا جان! مجھے رُپے کی ضرورت ہے۔"

"تجھے رُپے کی کیا ضرورت ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

وہ بولے، "باباجان! میں اپنی مرضی کا ایک محل بنوانا چاہتا ہوں آپ مجھے اس کی اجازت دے دیں۔"

بادشاہ نے اجازت دے دی۔

اب محمود ہر وقت سوچتے رہتے کہ محل بنوایا جائے تو کیسا بنوایا جائے، ایسا تو ضرور ہو کہ جو شخص بھی اسے دیکھے، حیران رہ جائے۔ انھوں نے غزنی کے بڑے بڑے استادوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ ایسا محل تیار کر دو کہ اس کی شہرت دور دور تک پہنچ جائے اور اس کی دیواریں اس طرح چمکیں، جیسے واقعی شیشے کی بنی ہیں۔"

سب سے پہلے محل کے لیے خاص جگہ تلاش کی گئی۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی، جو سارے شہر میں سب سے خوب صورت سمجھی جاتی تھی۔ وہاں محل کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے بعد تو محمود کو ہر وقت یہی فکر رہتی تھی کہ محل ایسا بنے کہ لوگ دور دور سے آکر اسے دیکھیں اور کوئی شخص بھی تعریف کیے بغیر یہاں سے نہ لوٹے۔

محل تیار ہونے لگا۔ محمود رات دن وہیں رہتے تھے۔ کاریگروں کی نگرانی کرتے تھے اور ہر ایک چیز کا خود خیال رکھتے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے محل تیار ہو گیا۔

دیکھنے والے کہتے تھے کہ ایسا شاندار، خوب صورت اور عظیم الشان محل کہیں بھی نہیں ہوگا۔ جب سورج طلوع ہوتا تھا تو اس کی دیواریں جگمگا اٹھتی تھیں، جیسے ان میں اَن گنت ستارے جڑے ہوں اور

بیل بوٹے اتنے خوب صورت ہیں کہ جو شخص انھیں دیکھتا تھا بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔
لوگ تھے کہ دُور دُور سے آکر دیکھ رہے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ خود بادشاہ نے ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ اس کے بارے میں کچھ پوچھا ہی تھا۔ محمود کی بڑی خواہش تھی کہ بادشاہ اُن کا محل دیکھیں اور تعریف کریں چناں چہ ایک دن موقع پاکر انھوں نے بادشاہ سے کہا، "باباجان! آپ کو معلوم ہے محل تیار ہوگیا ہے"۔
بادشاہ نے جواب دیا، "ہاں محمود بیٹے! سنا ہے محل تیار ہو چکا ہے"۔
"تو باباجان چل کر دیکھیے تو سہی کہ کیسا ہے"۔ محمود نے کہا۔
بادشاہ بولے، "بہتر، کسی دن دیکھ لیں گے"۔
ایک دن بادشاہ شکار پر جا رہے تھے۔ محمود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بولے، "آج دیکھ لیجیے چل کر، آپ کو فرصت ہے"۔
"بہت اچھا!"
یہ سن کر محمود بہت خوش ہوئے کہ ان کی ایک بڑی آرزو پوری ہو رہی ہے۔
بادشاہ چند آدمیوں کو ہمراہ لے کر نئے محل کی طرف جانے لگے۔ جیسے ہی محل کے دروازے پر پہنچے، جو لوگ بادشاہ کے ساتھ آئے تھے محل کی تعریفیں کرنے لگے، "واہ کتنا خوب صورت اور عالی شان محل ہے۔ دیواریں تو شیشے کی بنی ہیں اور بیل بوٹوں کا تو جواب ہی نہیں"۔
سب کے سب تعریف کر رہے تھے، مگر بادشاہ خاموش تھے۔ انھوں نے تعریف کا ایک لفظ بھی ابھی تک منھ سے نہیں نکالا تھا۔
کئی کمروں سے ہوتے ہوئے وہ محل کے اس کمرے میں پہنچے، جو سب سے زیادہ خوب صورت تھا اور جس کی دیواروں اور چھت میں نہایت قیمتی موتی جڑے تھے۔ محمود کو پوری پوری اُمید تھی کہ بادشاہ اس کی تعریف ضرور کریں گے۔ انھوں نے کہا،
"باباجان! آپ نے دیکھا یہ شیش محل"۔
بادشاہ بولے، "ہاں بیٹا! دیکھ رہا ہوں"۔
"کیسا ہے؟" محمود نے پوچھا۔
بادشاہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحوں کے بعد آگے بڑھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اُس چھڑی کا سرا انھوں نے دیوار سے رگڑا، چمکتی دمکتی دیوار پر ایک خراش پڑ گئی۔
محمود اور باقی سب لوگ بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ بادشاہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ اس سے اُن کا مقصد کیا ہے۔ دیوار

میں انھوں نے خراش کیوں ڈال دی ہے، بادشاہ نے خراش کی طرف اشارہ کر کے محمود سے کہا،

"بیٹا! یہ خراش دیکھ رہے ہو۔ اس سے ہزار گنا خوب صورت محل کی دیوار میں بھی خراش پڑسکتی ہے۔ تم کوئی ایسا محل کیوں نہیں بناتے جس کی دیواریں ہمیشہ ہمیشہ خوب صورت رہیں اور جن پر کبھی کوئی خراش نہ پڑسکے۔"

اس وقت محمود کو باپ کی بات پر بڑا دکھ ہوا۔ مگر کچھ مدت بعد جب انھوں نے ان الفاظ پر غور کیا تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ باپ کی مراد کیا تھی۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے کو سمجھایا تھا کہ بیٹا! کوئی ایسا کام کرو کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے۔ یہ محل کیا ہے۔ ایک مدت کے بعد اس کی پہلی سی حالت نہیں رہے گی اور جب زیادہ عرصہ گزر جائے گا تو تباہ و برباد ہو جائے گا۔ نیک کام ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ان کی چمک دمک میں کبھی فرق نہیں آتا۔

ایک حیرت انگیز اعلان

ہمدرد نونہال کی سالانہ خریداری کے لیے نومبر دسمبر ۱۹۶۴ء کے شماروں میں اعلان کیا گیا تھا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۴ء تک آٹھ رُپے ارسال کرنے پر ایک سال کے لیے ہمدرد نونہال جاری کرنے کے علاوہ ایک کتاب "وسط ایشیا کی سیاحت" (جس کی قیمت ڈھائی رُپے ہے) بھی بلا قیمت ارسال کی جائے گی۔ نونہالوں کے مطالبہ پر تاریخ میں اضافہ کر کے ۳۱ جنوری ۱۹۶۵ء کر دی گئی ہے۔ اب آپ جنوری کے آخر تک آٹھ رُپے منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھجوا کر ہمدرد نونہال کے سالانہ خریدار بننے کے علاوہ مذکورہ کتاب بھی بلا قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔ وی پی کے ذریعہ خریدار بننے والے حضرات کو یہ کتاب نہیں پیش کی جا سکے گی۔ اس اعلان سے جلد فائدہ اٹھائیے۔ اس طرح آپ ہمدرد نونہال کے بارہ پرچے جن کی فی پرچے کے حساب سے مجموعی قیمت نو رُپے ہوتی ہے اور ڈھائی رُپے کی کتاب "وسط ایشیا کی سیاحت" کل ساڑھے گیارہ رُپے کے بجائے آٹھ رُپے میں حاصل کر سکیں گے۔

محنت کرو ہمیشہ

عابد نظامی

محنت کرو کہ اس سے، ہوتا ہے نام حاصل
محنت کرو کہ اس سے بنتے ہیں لوگ فاضل
محنت نہیں جو کرتا، کہتے ہیں اس کو کاہل
محنت کرو ہمیشہ!

ہے آرزو اگر یہ، حاصل ہو تم کو عزّت
اس پاک سرزمیں پر پھیلے تمھاری شہرت
تو رات دن کرو تم پڑھنے میں خوب محنت
محنت کرو ہمیشہ

محنت نہ جو کرے گا کہلائے گا نکمّا!
تحقیر کی نظر سے دیکھے گی اُس کو دُنیا
عزّت کا کوئی مَنصب اُس کو نہ مل سکے گا
محنت کرو ہمیشہ

شہد

فیہ شفاءُ اللنّاس

اس میں انسانوں کیلئے شفا ہے

شہد انسان کے لئے قدرت کا ایک بیش قیمت عطیہ ہے۔ صحت قائم رکھنے اور جسمانی نشوونما کیلئے اس لطیف، زود ہضم اور مقوی غذا کا کوئی نعم البدل نہیں۔
۴ اونس کے ٹیوب میں
پیک کیا ہوا ہمدرد کا خالص مُصفّا شہد
پورے اعتماد سے استعمال کیجئے۔

بچوں کے لئے ایک نعمت ہے
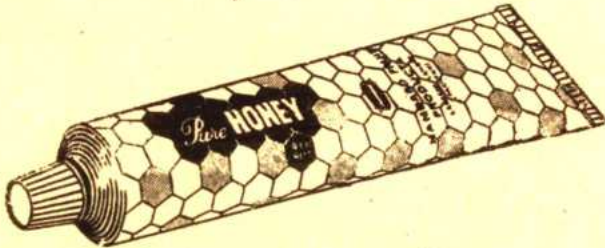
ہمدرد کے ہر سیلز ڈپو، عام دکانوں پر اور خصوصاً مندرجہ ذیل کیمسٹوں کے ہاں ملتا ہے۔

کریسنٹ کیمسٹس
شاہراہ عراق، صدر۔ کراچی

کوئنز کیمسٹس
وکٹوریا روڈ، صدر، کراچی

ہمدرد فروٹ پروڈکٹس۔ لاہور۔ کراچی

united

H.H-1/1080

ایک حیرت ناک سچی کہانی

عشرت رحمانی

چیختے بھاگتے جنگل

تم نے لکڑی کے بھاری بھاری اور لانبے لانبے شہتیر اور لٹھے تو دیکھے ہوں گے۔ ان سے مکانوں کے لیے چھتوں کی کڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ تختوں سے دروازے، کھڑکیاں اور فرنیچر کا سامان، کرسیاں، میزیں، تپائیاں، سب ہی کچھ بنتا ہے۔ غرض جس قدر لکڑی اور اُس کے تختے انسان کی ضرورتوں کے کام میں آتے ہیں

ان بھاری بھاری لمبے شہتیروں سے بنتے ہیں۔ یہ شہتیر کہاں سے آتے ہیں؟ جنگلوں اور بنوں سے درخت کاٹ کر ان کے شہتیر بنتے ہیں اور پھر ضرورت کے موافق اُن کے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیتے ہیں یا آرا مشین سے چیر کر تختے بنا لیتے ہیں۔ پاکستان میں سب سے زیادہ گھنے جنگل اور بَن مشرقی پاکستان کے علاقے میں ہیں۔ وہاں ایسے ایسے بَن ہیں جنھیں کجری بَن کہتے ہیں اور دن کے وقت بھی وہاں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ شیر، چیتے، تیندوے، ہرن، نیل گائے، بارہ سنگھے ہر قسم کے جنگلی جانور رہتے ہیں۔ وہیں سے درختوں کو کاٹ کر ان کے شہتیر بناتے اور انھیں دریا میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ شہتیر دریائی راستے سے سفر کرکے خود بہ خود مغربی پاکستان پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ٹھیکے دار سوداگر مشرقی پاکستان کے علاقے میں جنگل خرید لیتے ہیں، یعنی کئی علاقے کے درختوں کو ٹھیکے پر لے کر سرکاری محکمۂ جنگلات کو اس کی قیمت ادا کر دیتے ہیں اور پھر مزدوروں سے درخت کٹوا کر شہتیر جمع کرکے ملک کے جس حصے میں لے جانا چاہتے ہیں، لے آتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں بھی جنگل اور بَن ہیں۔ یہاں سے بھی درخت خرید کر شہتیر بنائے جاتے ہیں لیکن مشرقی پاکستان میں بہت گھنے اور بڑے بڑے بن ہیں۔

اب ہم تمھیں تاریخ کے بہت پرانے زمانے کی بڑی مزے دار کہانی سناتے ہیں، جسے پڑھ کر تم تعجب کروگے کہ مشرقی پاکستان سے تو شہتیر دریائی سفر کرکے دوسرے علاقے میں آتے ہیں، مگر اُس زمانے کے پورے پورے جنگل درخت لگے لگے چلنا شروع کر دیتے تھے اور اس تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے تھے کہ ان کو روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی آپ بیتی ہے، جو دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑا شہتیر جمع کرنے والا مانا گیا ہے۔ یہ امریکا میں تھا اور امریکی حکومت کی طرف سے اس کام کے لیے مقرر کیا گیا تھا کہ وہاں کے مختلف علاقوں کے جنگلوں اور بنوں میں جائے اور درختوں کے شہتیر تیار کراکے لکڑی فراہم کرے۔ اس کا نام پال بنیان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پال بنیان ہی سب سے پہلا ماہر تھا، جس نے جنگل

کے جنگل کاٹ کر شہتیر بنانے اور انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لاکر لکڑی جمع کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ وہ ہزاروں آدمی اپنے ساتھ لیے قسم قسم کے ہتھیاروں کے ساتھ رات دن جنگلوں اور ڈنڈک بنوں میں گھومتا پھرتا۔ گویا ایک بھاری فوج اس کے ساتھ تھی۔ وہ ڈیرے، خیمے لیے ہر موسم میں جنگلوں ہی میں رہا کرتی۔ وہ اس فوج کا حاکمِ اعلا یا سردار تھا۔ اس کے بہت سے اور ماتحت افسر بھی تھے۔ ان کے پاس بہت سی بڑی بڑی مشینیں اور شہتیر لاد کرلے جانے کے لیے گاڑیاں اور ہر طرح کے آلات تھے، جس میں سے بہت سے خود پال بنیان نے ایجاد کیے اور کاری گروں کو ہدایات دے کر بنوائے تھے۔

صرف ایک کلہاڑا ایسا تھا، جسے ساٹھ آدمی مل کر اٹھاتے اور اس سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح شہتیروں کو اکٹھا کرنے اور دریا میں ڈال کر راستے پر بہا لے جانے کے لیے بہت سے کارآمد آلے اور مشینیں بنائی تھیں، جن میں سے اکثر ہر ملک میں اور ہمارے پاکستان میں بھی اسی کے نمونے پر کام میں لائی جاتی ہیں۔

پال تھوڑے دنوں میں ملکوں ملکوں مشہور ہوگیا۔ جنگلوں، بنوں اور دریاؤں، سمندروں کے علاقوں میں سب لوگ اس کو جاننے لگے۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو عجیب و غریب واقعات پیش آتے رہے جنھیں وہ استقلال سے برداشت کرکے اپنے کاموں میں دل چسپی کے ساتھ مصروف رہتے۔ بعض دفعہ ان لوگوں کو ایسی دشواریوں کا سامنا بھی ہوا کہ ان کی عقل اور ہمت جواب دے گئی، مگر مثل مشہور ہے ؏

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

پال نے بہادری سے ان دشواریوں کا مقابلہ کیا۔ اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھائی اور انھیں مشکل سے مشکل کام میں کام یابی حاصل ہوئی اور اس کے حوصلہ، ہمت اور عقل مندی کے سبب اس کا نام اور یہ کام ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔

پال کی سرگزشت میں سب سے عجیب واقعہ درختوں کا سفر ہے، یعنی جنگل کے جنگل چل پڑتے اور میلوں دور تک چلے جاتے۔

گرمیوں کا آخری موسم تھا۔ پال نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ پہاڑی علاقوں میں پڑاؤ کریں، جہاں کے درخت بڑے "تناور،

لانبے ہوتے ہیں اور ان کی لکڑی عمدہ اور نرم ہوتی ہے، جو اعلا قسم کے فرنیچر کے کام میں لائی جاتی تھی۔ پال لشکر کے ساتھ روانہ ہوا اور راستے میں ایک وادی میں اس نے اپنے مطلب کے جنگل کا پتہ چلا لیا۔ یہاں ایسے شان دار بلند و بالا درخت تھے، جو اس سے پہلے پال نے بھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ بہت خوش ہوا اور لشکر کو پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ اب اس کو یہ فکر ہوئی کہ اس علاقے کے سردار سے ملے اور اس سے جنگل کی خریداری کی بات چیت کرے، کیوں کہ اس زمانے میں جنگلوں اور بنوں میں رہنے والے قبیلے ہی وہاں کے مالک ہوتے تھے اور ان کی مرضی کے بغیر سرکاری آدمیوں کو بھی ایک درخت کاٹنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اس پہاڑی علاقے میں ریڈ انڈین قبیلے کے لوگ بستے تھے۔ پال ان کے سردار سے ملا۔ اسے اپنا مطلب سمجھایا اور قیمت طے کرکے اس کو آمادہ کرلیا کہ جنگل کاٹ لیا جائے۔ امریکی حکومت نے اپنے واشنگٹن کے دفتر سے معاہدہ تیار کراکے پال کے پاس بھجوادیا کہ سردارِ قبیلہ سے دستخط کرالیں۔ معاہدے کی تین سو نقلیں تھیں۔ سردار اَن پڑھ تھا۔ وہ

دستخط کرنا کیا جانے۔ پال نے اس کی ترکیب بھی سوچ لی۔ اس نے اسے دستخط کی جگہ "×" کا نشان بنانا سکھا دیا۔ یہ نشان ایک جانور "ٹرکی" کے پنجے کا تھا، جو قبیلے کے سردار نے پال رکھا تھا۔ پال بنیان کو یہ انوکھی تدبیر سوجھی کہ معاہدے کے تمام کاغذ زمین پر بچھا کر اس جانور کو اس پر اس طرح چلنا سکھایا کہ ہر کاغذ پر اس کا ایک ایک قدم پڑتا جائے اور اس کے پنجے کا نشان دستخط کی طرح معاہدے پر ثبت ہوجائے۔ جب ٹرکی اس طرح چلنا سیکھ گیا تو اس کے پنجوں پر سُرخ روشنائی مل کر اسے کاغذوں پر چھوڑ دیا۔ ٹرکی نے قدم قدم ایک ایک کاغذ پر بڑی شان سے دستخط کا نشان جما دیا۔ اس کا مالک اس کی ڈوری پکڑے ہوئے آگے آگے تھا اور وہ اس کے پیچھے اس کی جگہ اپنے قدموں سے دستخط کررہا تھا۔ اس کام سے بھی اطمینان ہوا۔ لشکر کے سب لوگ اس رات بڑے خوش تھے کہ صبح سے درختوں کی کٹائی شروع کریں گے۔ کچھ

تو کھانے پینے کا انتظام کر رہے تھے ، باقی مزدور سب کے سب اپنے آلات اور ہتھیاروں کو تیز کرنے کے لیے رگڑنے میں مصروف تھے۔
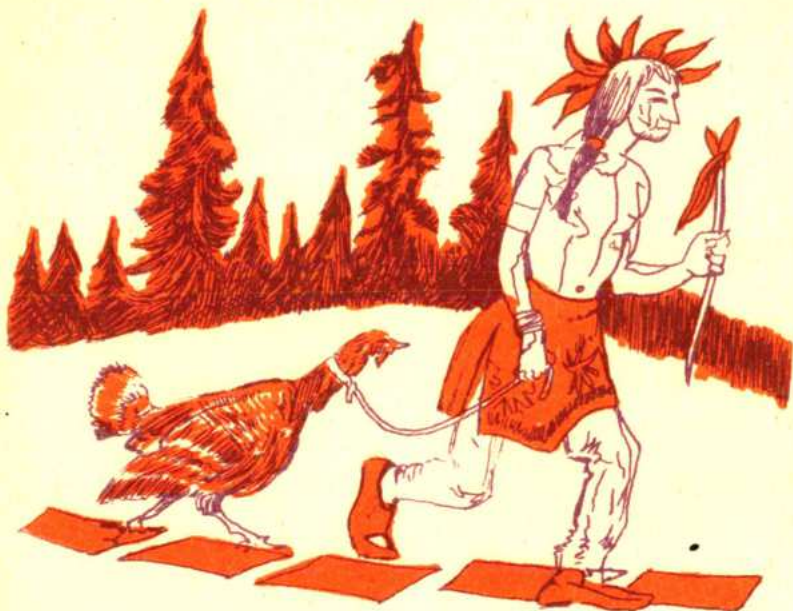
آخر اپنے کاموں سے فراغت حاصل کرکے آرام سے کھا پی کر چین سے سو گئے۔ صبح سویرے مزدوروں کا افسر سب سے پہلے سو کر اٹھا۔ وہ اپنے دل میں بہت خوش تھا کہ آج شہتیروں کا ڈھیر ان کے قبضے میں ہوگا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جارہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مَلیں اور قریب کے چشمے پر جاکر جلدی جلدی ہاتھ منھ دھویا ، دانت صاف کیے ، لیکن جب اچھی طرح اپنے ہوش و حواس درست کرکے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اُسے جنگل کا سماں کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ پہلے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا بات ہے ، لیکن غور سے دیکھنے پر

معلوم ہوگیا کہ سامنے جو جنگل تھا، وہ اب وہاں سے غائب ہے۔ وہ چاروں طرف حیران ہوکر دیکھنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر اُسے یقین ہوگیا کہ ہم وہاں اس وقت نہیں ہیں، جہاں رات کو قیام کیا تھا۔ شاید مجھے یاد نہیں رہا۔ پال بنیان نے رات گئے کوچ کا حکم دے دیا ہو اور ہم وہاں سے کہیں اور آگئے ہیں، کیوں کہ وہاں تو چاروں طرف گھنے درخت تھے اور یہاں صاف میدان ہے۔

یہ سوچ سام دوڑا ہوا پال کے پاس گیا اور اس سے دریافت کیا کہ ہم لوگ یہاں کب اور کیسے پہنچے؟ اور جنگل کو پیچھے کیوں چھوڑ آئے؟

پال نے ابھی تک اپنے خیمے سے نکل کر باہر کی حالت نہیں دیکھی تھی۔ وہ سام کی گفتگو سن کر بولا "تم ہوش میں ہو یا نشے میں باتیں کر رہے ہو؟ ہم وہیں ہیں، جہاں کل پڑاؤ کیا تھا اور جنگل اسی طرح موجود ہے، جیسے کل رات تھا۔"

سام نے اُسے بتایا کہ یہاں تو ایک درخت کیا، ایک پتّہ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ سام کو واقعی نشے میں سمجھ کر جلدی سے غصّے میں باہر نکلا کہ اسے جنگل دکھائے اور اس کا دماغ اچھی طرح ٹھیک کرے۔

لیکن وہ باہر نکل کر سامنے نظر ڈالتے ہی حیران رہ گیا۔ وہاں تو سچ مچ منظر ہی کچھ اور تھا۔ آخر اس نے اپنے دوسرے ماتحت افسروں کو بُلایا اور سب نے مل کر مشورہ کیا۔ آخر طے پایا کہ شاید راتوں رات قبیلے والوں نے چالاکی کی ہے اور سامنے کے سارے درخت کاٹ کر جنگل اُڑا لیا۔ ہمیں فوراً یہاں سے آگے چل کر اگلے جنگل پر قبضہ کرنا چاہیے اور یہ لشکر کوچ کرکے اگلے جنگل میں پہنچ گیا۔ وہاں ڈیرے خیمے لگا دیے اور پچھلی رات کی طرح یہاں بھی آرام سے سو گئے کہ دوسرے دن صبح کو کٹائی شروع کریں گے۔ صبح کو جب سو کر اٹھے تو دیکھا کہ وہاں بھی ایک درخت موجود نہیں۔ جنگل کا جنگل پھر غائب تھا۔

اب تو پال کو بہت فکر ہوئی اور

اس نے اگلے جنگل کو کوچ کر کے جب وہاں لشکر کو ٹھیرایا تو اپنے ماتحت افسروں کو حکم دیا کہ آج کوئی نہ سوئے اور رات بھر پہرہ دے کر دیکھیں کہ یہ کیا گڑ بڑ ہے اور درختوں کو کون اڑا لے جاتا ہے۔ چناں چہ چار پانچ افسر اپنے ساتھ کچھ آدمیوں کو لے کر درختوں کے جُھنڈ میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ آدھی رات تک وہ جاگتے رہے۔ سارا جنگل اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ کوئی شخص وہاں سے گزرتا بھی نظر نہ آیا۔ پچھلے پہر انھیں نیند آنے لگی۔ سب کے سب اونگھنے لگے۔ اتنے میں سائیں سائیں کی بھیانک آوازیں آنے لگیں اور پھر زور زور سے سیٹیاں بجنی شروع ہوئیں۔ اس شور سے ان سب کی آنکھ کھل گئی۔ اب جو دیکھتے ہیں تو چاروں طرف سے درختوں کی قطاریں تیزی سے سامنے کی طرف بھاگتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ آگے آگے بڑے اور لانبے درختوں کی قطاریں تھیں اور ان کے پیچھے چھوٹے درخت چلے جاتے تھے۔ ایک

جھاڑی دار درخت ایک افسر کے پاس سے بھاگتا ہوا گزرا، اس نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا، مگر وہ درخت اس طرح چیخا چلّایا، جیسے کسی ضدی بچّے کو پکڑیں اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بھاگنے کی کوشش کرے۔ افسر نے اس کو قابو کرنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ اس کی گود سے نکل کر اگلے درختوں کے پیچھے چیخیں مارتا ہوا بھاگا۔ افسر دیکھتا رہ گیا۔ صبح ہوئی تو وہاں کا جنگل بھی صاف تھا۔ سارے درخت بھاگ چکے تھے۔

ان افسروں نے پال بنیان کو جاکر سارا حال سُنایا۔ پال نے سب کو جمع کرکے مشورہ کیا۔ وہ سوچنے لگے کہ ہم نے اس سے پہلے کسی ریڈ انڈین کی زبانی یہ بات سنی تھی کہ جنگل بھاگتے ہیں۔ ہم سمجھے تھے یہ دل لگی ہے۔ بھلا جنگل کیسے بھاگ سکتے ہیں! اب ہم نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

آخر سوچ بچار کے بعد انھوں نے طے کیا کہ بھاری زنجیریں اور موٹے رسّے لے کر درختوں کو گھیرے میں لے لیا جائے اور وہ زنجیریں اور رسّے پہاڑی کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیے جائیں۔ سب مزدوروں نے رسّوں، زنجیروں سے جنگل کو گھیر کر پہاڑی سے باندھ دیا اور پال نے انھیں حکم دیا کہ اپنے اپنے کلہاڑے اور ہتھیار لے کر درختوں کو کاٹنا شروع کردیں، تاکہ رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے سب درخت کٹ چکے ہوں۔

جوں ہی سب مزدور تیار ہوکر درختوں کی طرف انھیں کاٹنے کے ارادے سے چلے، معلوم ہوا جیسے انسان اپنے سامنے ہتھیار بند قاتلوں کو دیکھ کر جان بچانے کے ڈر سے بھاگتے ہیں، سارے درخت چیختے، دھاڑیں مارتے اپنی اپنی جگہ سے بھاگنے لگے۔ ان کی چیخ پکار اور دھاڑنے کی خوف ناک آوازوں سے چاروں طرف ایسا شور ہوا، جیسے بھاری طوفان آگیا ہو اور مزدور ان کے پیچھے پیچھے اپنے آلات اور ہتھیار لیے دوڑے چلے جارہے تھے کہ انھیں پکڑ کر کاٹ ڈالیں۔ ساری وادی میں دن کی رات ہوگئی۔ درختوں کے سایوں سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ لوگوں نے میدانوں سے گھروں میں چھپنے کے لیے بھاگنا شروع کردیا اور چلّا چلّا کر کہنے لگے،" بھاگو، طوفان آگیا!" آخر درخت، جو چاروں طرف سے زنجیروں اور رسّوں میں جکڑے ہوئے تھے، گھیرے میں

آگئے اور پہاڑی سے ٹکرا ٹکرا کر زمین پر گرنے لگے۔ اُدھر مزدوروں نے آگے بڑھ بڑھ کر گرتے پڑتے اور چیختے چلاتے بڑے چھوٹے سب درختوں کو جڑوں سے کاٹنا شروع کردیا۔ شام سے پہلے پال نے جنگل کا صفایا کرڈالا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی اور سارا لشکر اطمینان سے کھا پی کر آرام سے سوگیا۔

صبح اٹھ کر انھیں کاٹ چھانٹ کر شہتیر بنائے گئے اور سب کو رسّوں میں باندھ کے دریا میں ڈال دیا، تاکہ اس علاقے میں پہنچا دیے جائیں، جہاں اُن کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد اگلے جنگلوں کو بھی اِسی طرح کاٹ کر پھینک دیا اور اس ترکیب سے سارے جنگل کاٹے جاتے رہے۔

کہتے ہیں، اس کے بعد پھر کبھی کسی علاقے میں درختوں کے چیخنے اور بھاگنے کے بارے میں کبھی نہیں سُنا گیا۔ جنگلوں کو کاٹ کر لکڑی جمع کرنے کا یہ طریقہ رفتہ رفتہ دوسرے شہروں کے لوگوں نے بھی سیکھ لیا، جو ساری دنیا میں آج تک جاری ہے۔

★

ضرورت ایجاد کی ماں
پَیراشوٹ
کِس طرح ایجاد ہوا؟
فہمیدہ اختر

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے، جب یورپ میں بڑے جھگڑے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ فرانس کے لوگوں نے اپنے بادشاہ کو قتل کر دیا اور سارے شاہی خاندان کا خاتمہ کرکے نئی حکومت قائم کرلی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں اپنے بادشاہ کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالنے والے کو پکڑ کر پھانسی دے دی جاتی۔ جگہ جگہ لوگوں کو گرفتار کیا جارہا تھا کہ کوئی کسی بادشاہ کے خلاف بغاوت نہ کر بیٹھے۔

اسی زمانے میں ایک شخص اندرے گارنین نامی، جو فرانس کا رہنے والا تھا، گھومتا پھرتا ہنگری کے شہر بُداپسٹ میں آنکلا اور اس کو جاسوسی کے الزام یا کسی اور شبہے میں پکڑ کر قلعے کے بُرج میں بند کر دیا گیا۔ بے چارا اندرے رات دن اس بُرج میں بند پڑے پڑے تنگ آگیا۔ وہ ہر وقت یہ سوچتا رہتا تھا کہ اس قید کی مصیبت سے کیسے چھٹکارا پائے۔ یہ قلعہ پہاڑی چٹانوں کے پاس بہت مضبوطی سے بنایا گیا تھا اور اس کے دروازے پر بھاری بھاری قفل پڑے ہوئے تھے۔ دروازہ مضبوط لوہے کا تھا، جسے توڑنا ممکن نہ تھا۔ قید خانے کی دیواروں میں تین طرف کھڑکیاں تھیں۔ دور دور تک کہیں کوئی آدمی دکھائی نہ دیتا تھا۔ دن بھر جنگلی پرندے بُرج کے اوپر منڈلاتے رہتے۔ صرف ایک بڈھا محافظ قید خانے کے باہر رہتا تھا، جو اندرے کے لیے کھانا تیار کرتا اور دن میں دو بار، دوپہر اور رات کو کھانا لاتا اور صبح ناشتہ دے جاتا۔ بس ان تین وقتوں کے سوا قید خانے کا دروازہ کسی وقت نہ کھلتا اور اندرے اس تنہائی کی قید میں پڑا اپنے گھر بار اور خاندان والوں کو یاد کرکے کڑھتا رہتا۔

رات کو جب وہ آسمان پر تارے چمکتے دیکھتا تو بے چین ہو کر قید خانے کی کھڑکی سے کود جانا چاہتا تھا کہ بُرج سے نکل کر میں بھی نیلے آسمان کے نیچے چمک دار تاروں کی چھاؤں میں بیٹھوں اور کھلی ہوا کھاتا پھروں یہ سوچ سوچ کر اس کا دل آزادی حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہا کرتا، مگر بُرج سے باہر نکلنا اُس کے بس میں کہاں تھا! پھر بھی اس کے دل میں اگر کوئی خواہش تھی تو یہی کہ کسی طرح بُرج سے کود کر آزاد ہو جاؤں۔

بُرج کی دیوار پر ہری ہری گھاس کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے دن میں کئی کئی بار جھانک کر اس بیل کو دیکھا کرتا اور سوچتا کہ اگر یہ بیل اتنی پھیل جائے کہ کھڑکی کے پاس تک آسکے تو میں آسانی سے اسے پکڑ کر رسّی کی طرح قلعے کی دیوار سے نیچے اتر جاؤں اور اسی لیے وہ بار بار اس بیل کو دیکھتا رہتا کہ وہ دیوار کی طرف بڑھ رہی ہے یا نہیں، مگر بھلا بیل اتنی کیسے بڑھ سکتی تھی۔ جس حساب سے وہ روزانہ نہیں، بلکہ ماہوار بڑھتی دکھائی دیتی تھی، اُس طرح شاید تیس چالیس برس میں کھڑکی کے قریب تک آتی اور شاید اس وقت تک غریب اندرے اس دنیا میں بھی نہ رہا ہوتا۔

اندرے اس سے پہلے دنیا بھر کے ملکوں میں گھوم پھر کر سیر و سیاحت کر چکا تھا۔ اس کو قسم قسم کی کہانیاں قصے اور تاریخی حالات پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ سائنس کی معلومات بھی تھیں، مگر اب اس کے پاس کوئی کتاب بھی نہیں تھی، اس لیے اسے خالی بیٹھے وقت گزارنا بھی سخت مصیبت معلوم ہوتا تھا۔ وہ وقت گزارنے

کے لیے پرانے زمانے کی باتیں اور وہ سب قصّے کہانیاں یاد کرتا رہتا، جو اس نے کبھی پڑھی تھیں۔ ایک دن اسے یاد آیا کہ کسی کتاب میں ایک سائنس داں انگریز لیور مانڈ کا ایک واقعہ پڑھا تھا کہ وہ کسی اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ اس کے پاس چھتری تھی۔ اس نے چھتری کھولی اور اُسے پکڑے ہوئے ایک دم اس جگہ سے نیچے کود پڑا اور بالکل صحیح تن درست زمین پر جا کھڑا ہوا۔ اندرے اس خیال سے ایک دم خوش ہو گیا، لیکن پھر فوراً ہی اسے ناامیدی ہو گئی، کیوں کہ اس نے سوچا کہ مجھے اس سے کیا فائدہ؟ یہاں چھتری کیسے مل سکتی ہے۔ قید خانے میں گھومنے پھرنے کی کوئی کھلی جگہ تو ہے نہیں، جو وہ اپنے محافظ سے بہانہ کرے کہ مجھے ایک چھتری کی ضرورت ہے کہ دھوپ کے وقت گھومنے پھرنے میں کام آسکے۔ اسے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ چھتری بھلا کیسے مل سکتی ہے۔ وہ مایوس ہو کر پھر چپ چاپ کھڑکی میں بیٹھا باہر دیوار پر پھیلی ہوئی گھاس کو تکنے لگا۔ پھر تھک کر اندرے بُرج میں آگیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اندرے بستر پر لیٹے لیٹے ایک دن اٹھ بیٹھا۔ اس کے دل میں امید کی ایک کرن چمکی۔ اس نے اپنی چادر اٹھائی اور اسے دونوں ہاتھوں میں پھیلا کر غور سے تکنے لگا۔ وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوب گیا اور سوچتے سوچتے ایک دم چادر گلے میں لپیٹ کر کھڑکی میں جا بیٹھا۔

اس نے اپنے دونوں پاؤں کھڑکی کے باہر لٹکا دیے اور پھر سوچنے لگا۔ کبھی نیچے زمین کی طرف دیکھتا اور کبھی چادر کو گھورتا۔ آخر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی اور تھک ہار کر اندرے اندر آگیا۔ محافظ اس کے لیے کھانا لایا۔ اس نے بڑی بے دلی سے کھانا کھایا اور محافظ کے جانے کے بعد وہ چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ رات کو دیر تک جاگتا، کیوں کہ سوچتے سوچتے اس کی نیند تو بالکل غائب ہو گئی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے اپنی چادر کو دونوں پاؤں میں اٹکا کر اپنے اوپر تان لیا اور جب

پاؤں کو اوپر اٹھایا تو چادر میں ہوا بھر جانے سے وہ پھول گئی۔ اب وہ اپنی چادر کو دیکھ دیکھ کر چھتری اور غباروں کے بارے میں سوچنے لگا۔ رات گئے اسے نیند آگئی اور خواب میں بھی وہ چھتری اور غباروں کو دیکھتا رہا۔ صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی، وہ پھر اپنی چادر کو تکنے لگا۔
ایک دم اس کو کوئی بات سُوجھی اور وہ جلدی سے اُٹھ کر اپنی چادر کے چاروں کونوں کو ایک ایک کرکے گانٹھیں دینے لگا۔ اس کے بعد اس نے ان چاروں کونوں کی ایک مضبوط گرہ بنائی۔ اب اس نے اس گرہ کو اپنے سر کے اوپر ڈال لیا اور چادر میں جس کے چاروں کونے بندھے ہوئے تھے، ہلا کر ہوا بھر دی۔ اس نے دیکھا کہ چادر پھول کر غبارے کی طرح بن گئی۔ اب تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا اور دل ہی دل میں دُعا مانگتا سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور کھڑکی کی منڈیر پر بیٹھ کر غبارہ بنی ہوئی چادر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوط پکڑے ہوئے ایک دم نیچے کود پڑا۔
"وہ مارا!" وہ فوراً زمین پر صحیح سلامت جا کھڑا ہوا اور خوشی میں زور سے چیخ اٹھا۔ بوڑھا محافظ بے چارا بہرہ تھا۔ اس نے اندرے کے گرنے کا دھماکا بھی نہیں سُنا۔
اب اندرے آزاد تھا۔ وہ جہاں چاہتا کھلے بندوں گھوم پھر سکتا تھا۔ وہ پہلے آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا تاکہ یہ دیکھ لے کہ اس کے کوئی چوٹ تو نہیں آئی اور یہ بھی اطمینان کرے کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ وہ آزادی پاکر خوشی سے جھوم رہا تھا۔ یہاں سے وہ پہلے پیرس گیا اور وہاں گاؤں میں گھوم پھر کر میلوں کے موقع پر اپنی چادر کے غبارے کا تماشا دکھانے لگا۔ وہ کسی اونچے ٹیلے یا عمارت پر چڑھ جاتا اور وہاں سے چادر کے غبارے کے سہارے زمین پر کود پڑتا۔ یہ تماشا دیکھنے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی، جو اُسے جادوگر سمجھ کر اس عجیب و غریب مزے دار کھیل کا انعام دیتے۔ اس کے بعد اس نے ایک چھتری خریدلی اور اس کے ذریعے کود کر تماشا دکھانے لگا۔ اس جادو کے کھیل سے اس نے خوب دولت کمائی۔ اب وہ کودنے کا کرتب خوب سیکھ گیا اور روزانہ اونچی اونچی چوٹیوں سے کود کر مشق کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ہزار سے لے کر دو ہزار فیٹ کی اونچائی تک سے آسانی کے ساتھ چھلانگ لگا دیتا اور چھاتے کی مدد سے جہاں چاہتا اتر پڑتا۔

ہوتے ہوتے یہی چادر کا غبارہ اور چھتری یا چھاتہ سے کودنے کا جادو سائنس جاننے والوں کے نئے نئے تجربوں کی بہ دولت وہ "پیراشوٹ" بن گیا، جسے ہمارے نئے سائنس کے زمانے میں ہوائی جہاز سے سلامتی کے ساتھ زمین پر اترنے کے لیے بے حد کارآمد سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔

توقیر

دیس دیس کی کہانیاں

سیبوں کی گاڑی اور درخت

(انڈونیشیا کی لوک کہانی)

ایک تھا گاؤں ۔ اس میں رہتا تھا ایک رئیس زمیندار۔ وہ تھا بہت کنجوس اور بد اخلاق ۔ کسی سے سیدھے منھ بات نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے باغ کے سیب گاڑی میں لے کر شہر کی منڈی میں جا رہا تھا ۔ سیب تازہ اور بہت ہی خوش نما تھے۔ لوگ اس کی گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک فقیر بھی پھٹے پرانے کپڑے پہنے وہاں آگیا۔ اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ بے چارا بھوکا ہے۔ وہ بھی للچائی نظروں سے سیب دیکھنے لگا۔ آخر زمیندار سے اس نے ایک سیب مانگا۔ زمیندار بھلا بغیر پیسے کے کسی کو سیب دینے والا تھا! اس نے فقیر سے کہا "جاؤ، یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تمھاری کیا ہمت ہے کہ سیب خریدو گے۔ یہاں کوئی خیرات تھوڑی بٹ رہی ہے۔ اگر میں مفت سیب بانٹتا پھروں تو اپنی ساری

دولت یوں ہی لٹا دوں۔ دوسرے آدمی، جو وہاں کھڑے تھے، اُن سے اس نے اس امید میں کچھ نہ کہا کہ شاید ان میں سے کوئی سیب خریدے۔ فقیر چپ چاپ کھڑا اس کی باتیں سنتا رہا اور سیبوں کی طرف دیکھتا رہا۔ زمیندار کو اس پر اور بھی غصہ آیا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا" تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" فقیر نے بڑی عاجزی سے کہا، "بھلے آدمی تیرے پاس سینکڑوں رُپے کے سیب ہیں اور اتنی دولت ہے، اگر ایک سیب مجھے دے دے گا تو تیری دولت میں کیا کمی آجائے گی؟" زمیندار غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں سے ایک شخص بولا، "زمیندار صاحب، اگر آپ اس کو اچھا سیب نہ سہی، ایک خراب سیب ہی دے دیں تو اس کا بھلا ہو جائے گا، آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس پر زمیندار اور بھی جل گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے ان کے لیے دولت خرچ کی ہے۔ نوکروں کو تنخواہیں دی ہیں، محنت کی ہے۔ اب منڈی میں بیچنے کے لیے جا رہا ہوں۔ خیرات تھوڑی کرنے آیا ہوں۔ اگر تمھیں اِس فقیر سے ہمدردی ہے تو اپنی جیب ہلکی کرو۔ سیب خرید و اور اس کو دے دو۔ اس پر اس شخص نے آگے بڑھ کر ایک سیب کی قیمت زمیندار کو دیتے ہوئے کہا کہ لو اب تو ایک سیب اس غریب کو دے دو۔ کنجوس زمیندار نے خوش ہو کر فوراً اس سے دام لے کر ایک سیب فقیر کو دے دیا۔ فقیر بولا" میں حیران ہوں کہ خدا نے بدمزاج کنجوس پر اتنی مہربانی کی ہے، مگر یہ ایک معمولی سیب بھی اس کے غریب بندے کو دینے کی مہربانی نہیں کر سکتا۔ میں نے تو خدا کی راہ میں اپنا گھر بار سب کچھ دے دیا۔ ہاں میرے پاس اس وقت سیبوں سے لدا ہوا ایک درخت ہے۔ اگر تم سب لوگ کچھ دیر یہاں ٹھیرو تو یہ سیب میں تم سب کو کھلا دوں۔" ایک شخص بولا" اگر تمھارے پاس سیبوں کا درخت تھا تو تم نے زمیندار سے سیب کیوں مانگا اور بے عزت ہوئے؟" فقیر نے کہا،" میں تمھیں ابھی سیب کا درخت دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے جلدی سے سیب کھایا اور اس کے بیج زمین میں ڈال دیے۔ تھوڑا سا پانی منگوا کر اس پر ڈالا۔ زمیندار کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا کہ یہ شخص لوگوں کو کیسے بے وقوف بنا رہا ہے۔ تمام لوگ فقیر کی طرف حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں زمین سے ایک پودا نکل آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درخت بن گیا اور خوش نما عمدہ سیبوں سے لد گیا۔ لوگ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔

فقیر نے درخت سے لال لال سیب توڑ کر ایک ایک سیب سب کو بانٹا۔ زمیندار یہ دیکھ کر بہت حیران تھا۔ جب سب سیب ختم ہو گئے تو فقیر نے درخت کو کلہاڑی لے کر کاٹ دیا اور اسے اپنے کندھے پر اٹھا کر چل دیا۔ جب زمیندار نے منھ پھیر کر اپنی سیبوں کی گاڑی کو دیکھا تو وہ حیران پریشان رہ گیا۔ اس کی گاڑی بالکل خالی تھی۔

زمیندار کو فوراً خیال آیا کہ فقیر نے جو سیب لوگوں میں بانٹے، وہ اصل میں میرے تھے۔ وہ غصّے میں لال پیلا ہو گیا۔ گاڑی کو وہیں چھوڑا اور فقیر کے پیچھے دوڑا، مگر بے کار، کیوں کہ فقیر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ فقیر نے کنجوس زمیندار کے ساتھ انوکھا مذاق کیا ہے تو وہ سب بہت خوش ہوئے اور زمیندار کو شرمندہ کرنے لگے کہ تم ایک سیب نہیں دیتے تھے، اب خدا کی طرف سے تمھاری خود غرضی اور بد اخلاقی کی تم کو خوب سزا ملی۔ اپنی خالی گاڑی منڈی میں لے جاؤ اور دولت سے بھر لو۔ زمیندار کھسیانا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ جس نے سُنا، اُس نے کہا، "واقعی لالچ اور خود غرضی بہت بُری بَلا ہے۔"

بار بار پڑھنے کے قابل

شائق سہارن پوری

آدابِ محفل

ہمارے بزرگوں نے بہت سی چیزیں ایسی لکھی ہیں، جو ایک زمانہ گزرنے کے بعد اب بھی پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں۔

جائے گر محفل میں تو اے میری جاں — بیٹھ اپنے مرتبے سے تو وہاں
اور نہ مسند پر یکایک بیٹھ جا — تا اٹھا دیوے نہ کوئی دوسرا
خندہ[1] زن ہرگز نہ ہو ہر بات پر — قدر کم ہوتی ہے خفت[2] بیشتر
اور اپنی واں ثنا[3] خوانی نہ کر — دیدہ[4] و دانستہ نادانی نہ کر
کر نہ تو تعریفِ محفل میں اخی[5] — اپنی تصنیفات اور فرزند[6] کی
محفلِ غم میں نہ کر ذکرِ سرور — زہر میں شکر ملانا کیا ضرور
ہو کہیں گر محفلِ شادی عیاں[7] — کر نہ غم کا ذکر واں اے نکتہ داں
اور لوگوں کا نہ کر قطعِ کلام! — تھام شمشیرِ زباں کو اپنی تھام
اور نہ چٹخا انگلیوں کو بار بار — ہے زبوں[8] یہ فعل سن اے ہوشیار
کہہ دیے ہیں قاعدے تجھ سے یہ سب — بیٹھ محفل میں تو ہر دم باادب

[1] ہنسو مت [2] سُبکی [3] تعریف [4] جان بوجھ کر [5] میرے بھائی [6] بیٹا [7] ظاہر [8] بُرا

علی ناصر زیدی

زلزلے کیوں آتے ہیں؟

تم جانتے ہو گے کہ زمین کے یکایک ہل جانے کو زلزلہ کہتے ہیں، لیکن ایک ہی وقت میں ساری زمین پر زلزلہ نہیں آتا، بلکہ صرف کچھ علاقے پر اس کا اثر

پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زمین ابھی تک بہت زیادہ گرم ہے۔ اس کی باہر کی سطح ٹھوس ہے، لیکن دس میل کی گہرائی کے بعد ہی اس کا وہ حصّہ شروع ہو جاتا ہے، جو پگھلی ہوئی حالت میں ہے۔

جب کبھی کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو اس کے منھ سے یہی پگھلا ہوا مادّہ باہر نکلتا ہے۔ اس مادّے کو لاوا کہتے ہیں۔ وہ نہایت گرم ہوتا ہے، اِس لیے جو چیز اس کے راستے میں آتی ہے، وہ جل کر راکھ ہو جاتی

ہے۔ زمین کا اندرونی درجۂ حرارت پانچ ہزار ڈگری فیرن ہائٹ کے قریب سمجھا جاتا ہے۔

زمین کے بیچ کا حصّہ بالکل پگھلی ہوئی حالت میں ہے۔ درجۂ حرارت کے اِس فرق کی وجہ سے زمین کے اندر ہلچل مچی رہتی ہے۔ کوئی حصّہ سُکڑتا ہے تو کوئی پھیلتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر یا دریا کا پانی کسی شگاف میں سے گزرتا ہوا زمین کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں یکا یک بہت زیادہ بھاپ پیدا ہوجاتی ہے۔

جہاں تک ممکن ہوتا ہے، زمین اِن تبدیلیوں اور اس ہلچل کو برداشت کرتی رہتی ہے، لیکن اگر معاملہ حد سے گزر جائے تو پھر یہ لاوا کسی کم زور جگہ کو پھاڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ عام طور سے پہاڑ اس کی زد میں آتے ہیں۔ لاوا اُن کے منھ سے بڑی قوت کے ساتھ باہر نکلتا ہے۔ اس جھٹکے سے آس پاس کا علاقہ ہل جاتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ زلزلہ آگیا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمین کے اندر ہی اندر ہلچل پیدا ہوئی اور زلزلہ آگیا۔

شروع میں انسان ایسے خطرناک پہاڑوں سے واقف نہیں تھا۔ وہ یکایک پھٹ کر آس پاس کے تمام علاقے کو تباہ کردیتے تھے، لیکن اب سائنس دانوں کی کوششوں سے ایسے تمام پہاڑوں کا پتا لگا لیا گیا ہے۔ ایسے آلے بھی ایجاد ہوگئے ہیں، جو پہاڑوں کے پھٹنے اور زلزلہ آنے سے پہلے ہی لوگوں کو خبردار کردیتے ہیں۔

دنیا میں آتش فشاں پہاڑوں کی کُل تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ ان میں بھی صرف ساڑھے تین سو ایسے ہیں، جن کے پھٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔ باقی ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ بعض پہاڑ ایسے ہیں، جن سے ہر وقت دُھواں نکلتا رہتا ہے، جیسے ان کے اندر کوئی چیز کھول رہی ہے۔

اِسی قِسم کا ایک پہاڑ 'ولیسوویس' ہے، جو اِٹلی میں خلیج نیپلز کے قریب واقع ہے۔ شروع میں اس کی اونچائی چار ہزار دو سو فیٹ تھی، لیکن آتش فشانی کی وجہ سے کٹ کر وہ اب صرف

تین ہزار چھے سو ساٹھ فیٹ اونچا رہ گیا ہے۔
سب سے پہلے ۷۹ء میں یہ پہاڑ پھٹا اور پمپیائی کا پُررونق شہر اس لاوے کے نیچے دب کر رہ گیا۔ دو اور شہر بھی تباہ ہوئے اور دو لاکھ سے زیادہ انسان زندہ جل گئے۔

اس کے بعد ڈیڑھ ہزار سال تک کوہِ ویسوویس خاموش رہا، لیکن ۱۶۳۱ء میں وہ یکایک جاگ پڑا۔ جلتی ہوئی راکھ، لاوا اور گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ تک اس تباہی کا اثر پہنچا۔ اٹھارہ ہزار آدمی مر گئے۔ جب سے اب تک یہ پہاڑ تباہی کا سبب بنا ہوا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں دو دیہات اس کے لاوے کے نیچے دب گئے۔ نیپلز شہر پر بھی ایک گز گہری راکھ چڑھ گئی!

یوں تو آتش فشاں پہاڑوں کی لائی ہوئی تباہی اور زلزلوں کی داستانیں بے شمار ہیں، لیکن جیسا زلزلہ ۱۸۸۳ء میں آیا تھا، ایسا پھر کبھی نہیں آیا۔ اس سال سماٹرا کے قریب 'کراکوٹوا' نامی جزیرے پر ایک پہاڑ یکایک پھٹ پڑا اور ایسا خوف ناک شور پیدا ہوا کہ لوگوں نے بیس بیس میل تک اس کی آواز سنی۔ سارا جزیرہ گرد و غبار میں چھپ کر رہ گیا اور سینکڑوں میل تک اندھیرا چھا گیا۔ لاوے کی وجہ سے سمندر کا پانی اس قدر گرم ہو گیا کہ بے شمار مچھلیاں مر گئیں۔ کئی مہینے تک اندھیرا چھایا رہا اور زلزلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آتش فشاں پہاڑ کے اندر سے پوری پوری چٹانیں بڑے خوف ناک شور کے ساتھ باہر نکل آئی تھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرے کا دو تہائی حصّہ سمندر میں ڈوب گیا۔ دور دور تک اتنا اندھیرا چھا گیا کہ جہازوں کے وقت بھی راستہ تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ ایک جہاز، جو کراکوٹوا سے سولہ سو میل دور تھا، اس سے نکلی ہوئی راکھ کی لپیٹ میں آگیا! سمندر میں ایسی زبردست لہریں پیدا ہوئیں، جن کی بلندی پچاس فیٹ سے کم نہ تھی۔ ان لہروں نے آس پاس کے علاقے کو سخت نقصان پہنچایا۔ ساحلوں پر روشنی کے جتنے مینار کھڑے تھے، سب تباہ ہو گئے۔ تقریباً تین سو دیہات بھی تباہ ہوئے اور چھتیس ہزار سے زیادہ آدمی مر گئے!

یہ تھا دنیا کا سخت ترین زلزلہ۔ زلزلوں سے بہت سے نقصانات ہوتے ہیں، لیکن ان کے کچھ فائدے بھی ہیں، جو ہم تمھیں پھر کبھی بتائیں گے۔

لڑکی نے دُعا کی کہ اے خدا اس بادشاہ کو جو دوسروں کی خدمات سے فائدہ اٹھاتا ہے، بلّی بنا دے! ——— اور

بادشاہ بلّی بن گیا

پرانے زمانے کی بات ہے۔ ملک یونان میں ایک شکاری تھا، جس کا ایک کم سن بیٹا بھی تھا۔ جب شکاری مرنے کے قریب ہوا تو اس نے اپنی بیوی کو بلا کر وصیت کی، "شکاری بننا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ زندگی بہت ہی مصیبت میں گزرتی ہے۔ تم میرے بیٹے کو اس طرح تربیت دینا کہ وہ کوئی اور ہی پیشہ اختیار کرے۔ شکار کھیلنے کے لیے بھول کر بھی جنگل کا رخ نہ کرے۔ ورنہ میری طرح اس کے لیے بھی زندگی وبال بن جائے گی۔"

شکاری مر گیا۔ وقت گزرتا رہا اور اس کا بیٹا بڑا ہو کر ایک خوب صورت نوجوان بن گیا۔ ایک روز بیٹے نے اپنی ماں سے پوچھا، "میرا باپ مشہور شکاری تھا تو اس کی بندوق کہاں گئی؛ سنا ہے کہ وہ عجیب و غریب تھی۔ اناڑی کے ہاتھ میں ہوتی تب بھی اس کا نشانہ چوکتا نہیں تھا۔"

ماں کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ اس نے ٹالتے ہوئے کہا، "چھوڑو اس بات کو۔ جنگل بیابان کی خاک چھاننا اور اپنی جان پر کھیل کر شکار کھیلنا کوئی دل چسپ مشغلہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت

سے پیشے ہیں۔ کوئی اچھا سا کام شروع کرو۔ تمھارے باپ کی وصیت بھی یہی تھی کہ میرے بیٹے کو شکاری نہ بننے دینا۔"

"لیکن اس کی وجہ؟" لڑکے نے ماں سے بحث کرنی چاہی، "جو کام باپ نے اختیار کیا تھا، بیٹے کے لیے بھی مناسب ہو سکتا ہے، پھر مجھے کیوں روکا جائے، لیکن خیر، فی الحال تجربہ کے طور پر اس کو چلا کر آزمائش کی جائے کہ اس کی گولی ہمیشہ صحیح نشانے پر بیٹھتی تھی، کوئی شکار اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ کس حد تک درست ہے۔"

نوجوان لڑکا بڑا ہٹ دھرم تھا۔ وہ کسی طرح نہ مانا اور باپ کی بندوق لے کر جنگل کی طرف چلا گیا۔ وہ اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ ایک ہرن نظر آیا۔ اس نے فوراً بندوق سنبھالی، نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ ٹھائیں سے بندوق کی آواز سارے جنگل میں گونجی اور کچھ فاصلے پر ہرن مر کر ڈھیر ہو گیا۔ وہ اسے کندھے پر ڈال کر شہر کی بڑی منڈی میں لے گیا جہاں ہر قسم کی چیز اچھے داموں فروخت ہو جاتی تھی، لیکن اس روز اتفاق سے سلطنت کا وزیر خریداری کے لیے خود وہاں آیا ہوا تھا۔ ہرن پر اس کی نگاہ پڑی۔ جی للچایا اور اسے خرید لینا چاہا۔ لڑکے سے قیمت دریافت کی۔

لڑکے نے کہا "آپ خود ہی دام لگا دیجیے۔ آپ اس بازار میں کوئی نئے گاہک نہیں ہیں۔ ہر چیز کی قدر و قیمت سے بھی واقف ہیں۔"

وزیر نے جانچ پڑتال کے بعد کہا، "دس پیاسٹر مناسب ہیں۔ کوئی اور شخص اتنی رقم بھی نہیں دے گا۔"

"واہ، کیا خوب!" لڑکے نے بات نہ ماننے کے انداز میں سر ہلا کر کہا، "بہت نامناسب قیمت ہے۔ میں اتنی کم رقم ہرگز قبول نہیں کروں گا۔"

وزیر یہ ٹکا سا جواب سن کر بہت ناراض ہوا، کیوں کہ یہ اس کی زبردست توہین تھی، لیکن اس نے شکاری سے کچھ نہیں کہا۔ اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس چھوکرے سے بدلہ لینا چاہیے، تاکہ اس کی طبیعت درست ہو جائے۔ وہ سیدھا بادشاہ کے پاس پہنچا اور کہا، "عالی جاہ! بڑی منڈی میں ایک شکاری ایک ہرن بیچ رہا ہے، جو ابھی مار کر لایا ہے۔ وہ ہر طرح آپ کے لائق ہے۔ آپ کے دسترخوان کی زینت بن سکتا ہے۔ آپ کے مہمان اس کا گوشت کھا کر بڑی تعریف کریں گے۔ میں اس کو محل میں طلب کر لیتا ہوں، لیکن اس کی قیمت

ڈیڑھ پیاسترسے زیادہ نہ دی جائے۔ خواہ مخواہ ایسے لوگوں کے دماغ اونچے ہوجاتے ہیں اور وہ عام گاہکوں کو بھی ستاتے ہیں۔"

وزیر نے فوراً شاہی پیغام بر روانہ کیا اور شکاری کو محل میں طلب کرلیا۔ اسے حکم ملا کہ ہرن لے کر فوراً بادشاہ کے حضور میں آؤ۔ شکاری اس حکم کی تعمیل کے لیے مجبور تھا۔

جب وہ ہرن لے کر شاہی محل میں پہنچا تو بادشاہ نے اس کی تعریف کی اور قیمت دریافت کیے بغیر اسے شاہی باورچی خانہ میں بھجوادیا، تاکہ شام کی ضیافت کے لیے جو اہتمام ہورہا ہے، اس میں ہرن کا گوشت بھی شامل کرلیا جائے۔ پھر بادشاہ نے خزانچی کو حکم دیا کہ اس شکاری کو ڈیڑھ پیاستر دے دو۔ نوجوان شکاری بادشاہ کا منھ دیکھتا رہ گیا، لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا، کیوں کہ بادشاہ کے ساتھ کسی بات پر بحث نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے خاموشی سے وہ قلیل رقم لی اور شکریہ ادا کرکے چلاگیا۔

دوسرے دن وزیر کے سکھانے پر بادشاہ نے شکاری کو اس کے گھر ہی سے طلب کرلیا اور جب وہ حاضرِ دربار ہوا تو کہا، "میں ہاتھی دانت کا ایک محل اپنے لیے تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ تم اچھے شکاری معلوم ہوتے ہو۔ ضرورت کے مطابق ہاتھی دانت فراہم کرنا تمھارے ذمّے ہے اور اس کے بعد محل بنانا بھی تمھارا ہی کام ہوگا۔ کمر ہمّت باندھ کر جنگل میں نکل جاؤ۔ تمھیں اس کام کا معاوضہ ملے گا۔ کچھ رقم چاہو تو پیشگی لے لو۔ کوئی اور امداد درکار ہو تو وہ بھی ملے گی۔"

بھلا انکار یا اعتراض کی ہمت کس میں تھی۔ بادشاہ نے یہ بھی کہا کہ اگر تم نے ذرا کوتاہی کی تو اس جرم کی سزا موت ہوگی۔

شکاری کا بیٹا مغموم صورت بنائے گھر چلا گیا۔ ماں نے اُسے دیکھا تو بے تاب ہوگئی۔ پریشانی کا سبب دریافت کیا۔ لڑکے نے سارا حال بیان کردیا اور کہا، "اب زندہ بچنے کی امید نہیں ہے، کیوں کہ اوّل تو اتنی مقدار میں ہاتھی دانت جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اگر یہ ممکن بھی ہوجائے تو محل کس طرح بن سکے گا۔ یہ فن تو میرے خاندان میں کسی کو بھی نہیں آتا۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو اس جرم کی سزا موت ہوگی، لہٰذا تم مجھے ایک تھیلا دو اور اس میں کھانے پینے کا کچھ سامان رکھ دو۔ میں خود ہی جلاوطن ہوجاتا ہوں۔ نہ کسی کو نظر آؤں گا اور نہ کوئی پوچھ گچھ

ہوگی۔ شاید کچھ عرصے میں بادشاہ اپنی اس فرمائش کو بھول جائے، یا اس کے بعد دوسرا بادشاہ ایسی ضد نہ کرے تب واپس آ کر تم سے مل لوں گا۔"

ماں کی ماری ماں بیٹے کی جدائی کے خیال سے رونے لگی۔ یہی ایک بیٹا اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ تاہم اس نے بیٹے کو دلاسا دیا اور کہا، "مجھے یاد ہے، تمھارے باپ نے ایک بار بتایا تھا کہ اونچے پہاڑ سے پرے ایک وسیع علاقہ ہے، جو ہاتھیوں کا جنگل کہلاتا ہے۔ وہاں رہنے والے ہاتھیوں کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے۔ ان میں سے اکثر ہاتھی ایک خاص تالاب پر پانی پینے آتے ہیں۔ تمھارے باپ نے ایک موقع پر خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر بادشاہ میری مدد کرے تو میں اس قدر ہاتھی دانت جمع کروں کہ پوری عمارت اس سے بن جائے۔ اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ تالاب کا سارا پانی نکال کر اس میں شراب کے پیپے انڈیل دیے جائیں۔ ہاتھی پانی سمجھ کر اس شراب کو پی لیں گے اور نشے میں چور ہو کر زمین پر لیٹ جائیں گے۔ انھیں تن بدن کا ہوش نہیں رہے گا۔ اس وقت ان کے دانتوں کو جلدی جلدی کاٹ لینا آسان ہوگا۔"

اس بیان کو سُن کر نوجوان شکاری کی ہمّت بندھ گئی۔ اس نے سوچا جو کام باپ نہیں کر سکا، اسے بیٹا کر دکھائے۔ بادشاہ نے خود ہی امداد کے طور پر پیشگی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ قسمت آزمائی جائے۔ شاید اس طرح کچھ کام بن جائے۔ چناں چہ وہ سیدھا بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس سے کہا، "آپ کو ضرورت کے مطابق ہاتھی دانت مل جائے گا، لیکن جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی امداد درکار ہو تو وہ مل سکے گی، مجھے اس کام کے لیے چالیس پیپے شراب چاہیے۔ اس کا فوراً انتظام کر دیا جائے اور میرے ساتھ کام کرنے کے لیے کچھ آدمی دیے جائیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کل پرسوں سے یہ کام شروع کر دوں گا۔"

بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے شکاری کی امداد کے لیے حکم جاری کر دیے اور دوسرے ہی دن ان کی تعمیل بھی ہوگئی۔

شکاری کا بیٹا تمام پیپے لدوا کر پہاڑ کے دوسری طرف کھلے میدان میں تالاب کے قریب لے گیا۔ سب سے پہلے اُس نے مزدوروں سے کہا کہ تم مشکیں بھر بھر کر

تالاب کا پانی نکالو اور ڈھلان کی طرف پھینکو تاکہ وہ دور تک بہہ جائے۔ سارا تالاب خالی کر دو اور پھر پیپوں کی تمام شراب اس میں الٹ دو۔

دو دن میں یہ کام ختم ہوگیا، تو شکاری اور سب لوگ لوہے کی تیز آریاں لے کر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے، کیوں کہ اس روز ہاتھیوں کے آنے کی امید تھی۔ جب سورج غروب ہوگیا اور کچھ دیر بعد ہر طرف اندھیرا چھا گیا تو دور جنگل میں ہاتھیوں کی چنگھاڑیں سنائی دیں۔ شکاری کے ساتھی بُری طرح ڈرنے لگے، لیکن اُس نے ان سب کو تسلّی دی اور یقین دلا دیا کہ تمھارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میری بندوق میں گولیاں موجود ہیں اور ان کے علاوہ پوری پیٹی بھری ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر میں کئی سو ہاتھی جھومتے جھامتے آئے اور چوں کہ بری طرح پیاسے تھے، اس لیے اپنی سونڈیں تالاب میں ڈال کر بے تحاشہ شراب پی گئے۔ ایک دم ان پر نشہ طاری ہوگیا۔ کچھ دیر تو وہ چیختے چلّاتے اور آپس میں لڑتے رہے، لیکن پھر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے اور اُنھیں کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ شکاری کو اسی مناسب وقت کا انتظار تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی سارا تماشا دیکھنے کے بعد جھاڑیوں سے باہر آگئے اور تیز آریوں سے ہاتھیوں کے دانت کاٹنے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر میں سب کا صفایا ہوگیا اور اس سے قبل کہ ہاتھیوں کا نشہ دور ہو، وہ سب دانت ٹھیلوں پر لاد کر شہر لے گئے اور کاریگروں کو بلوا کر کام شروع کر دیا۔

بادشاہ کا وزیر جس نے در اصل شکاری کے خلاف بادشاہ کو بھڑکایا تھا، اس کی اس کامیابی پر جل گیا۔ اب اس نے اپنی بیوی سے رائے لی کہ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ، جس سے شکاری کا پتہ ہمیشہ کے لیے کٹ جائے، کیوں کہ اسے اندیشہ تھا کہ اگر وہ بادشاہ کی نگاہ میں چڑھ گیا تو خود میری بھی خیر نہیں ہے۔

بیوی نے بہت سوچ سمجھ کر مشورہ دیا اور وزیر فوراً بادشاہ کے پاس گیا اور کہا، "حضور! اس میں شک نہیں کہ محل تو آپ کی شان کے لائق بن گیا ہے، لیکن اس میں رہنے کے لیے ایک نئی ملکہ بھی چاہیئے۔ سنا ہے کہ پہاڑ کے شمالی دامن میں

سات بھائی اکٹھے رہتے ہیں، جن کی ایک نہایت خوب صورت بہن بھی ہے، جو اب تک کنواری ہے۔ بھائیوں کا فیصلہ ہے کہ وہ اس کی شادی کبھی نہیں کریں گے اور جو ایسا خیال بھی ظاہر کرے گا، اسے مار ڈالیں گے۔ آپ شکاری سے کہیے کہ وہاں جائے اور اس خوب صورت لڑکی کو کسی طرح حاصل کر لائے۔"

بادشاہ نے وزیر کے بارے میں سوچا کہ یہ ہمارا کس قدر خیر خواہ ہے اور چوں کہ وہ پہلے سے ایک نئی نویلی دلھن کی تلاش میں تھا، اس لیے شکاری کے بیٹے کو بلا کر حکم دیا کہ سات بھائیوں والی بہن کسی نہ کسی طرح محل میں لے آئی جائے۔

شکاری کو بہت غصہ آیا، لیکن دل ہی دل میں جل بھن کر رہ گیا۔ بادشاہ کے خلاف وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ جب ایک بڑی مہم سر ہو گئی ہے تو یہ مشکل کام بھی کسی نہ کسی طرح آسان ہو جائے گا، لہٰذا اس نے اپنا تھیلا اٹھایا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس نے رخصت ہوتے وقت اپنی ماں سے کہا کہ بس تم میرے حق میں دعا کرتی رہنا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ضرور کام یاب رہوں گا۔

چلتے چلتے وہ ایک دریا کے کنارے پہنچا، جس کا پاٹ بہت بڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ساحل پر ایک شخص بیٹھا بے تابی کے ساتھ پانی پی رہا ہے اور پیے جا رہا ہے اور برابر یہ بھی کہہ رہا ہے، "میں پیاسا ہوں، میں پیاسا ہوں۔ میری پیاس کسی طرح نہیں بجھتی۔ اس دریا کا پانی بہت جلد ختم ہو جائے گا اور میں پیاسے کا پیاسا رہ جاؤں گا۔"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ دریا دور سے موجیں مارتا ہوا آتا اور وہ شخص اس طرح گرگر پانی پیتا کہ پھر دریا کا ایک دھارا بھی آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس سے آگے دریا کے صرف نشانات باقی تھے اور ہر طرف خاک اڑ رہی تھی۔ نوجوان شکاری نے پوچھا، "آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ تمھاری پیاس بجھنے نہیں پاتی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بیان کرو۔"

پیاسے نے کہا، "یہ روگ بچپن سے لگا ہوا ہے اور کسی کے پاس اس کا علاج نہیں ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ مجھے تنہا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اگر مجھے ساتھی مل جائے تب بھی مجھے تسکین رہے اور میں اس قدر بے تحاشہ پانی نہ پیوں۔

شکاری کے بیٹے نے کہا، "آؤ، ہم

ایک دوسرے کے ساتھی بن جائیں" اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد دونوں آگے روانہ ہو گئے۔

وہ شمال کی جانب چلے جا رہے تھے کہ انھیں ایک اور شخص ملا، جو بہت سی آگ سلگائے اس کے قریب سکڑا بیٹھا تھا،

پھر بھی اس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا۔ اس نے چلّا کر کہا، "مجھے سردی لگ رہی ہے، سخت سردی۔ میں اکڑ رہا ہوں۔ ٹھنڈ سے مرا جاتا ہوں۔ کیا دنیا کی کسی چیز میں گرمی نہیں رہی۔ حرارت کا نام ہی مٹ کر رہ گیا

ہے۔ خدا کے لیے مجھے اپنے ساتھ ایسی جگہ لے چلو جہاں سردی کا نام و نشان تک نہ ہو۔"

نوجوان شکاری نے اپنا لبادہ اتار کر اسے اڑھا دیا اور ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ اب وہ ایک کی بجائے تین مسافر ہوگئے۔ ان کا سفر شمال کی جانب جاری رہا۔

راستے میں انھیں ایک اور شخص ملا، جو بہت ساری روٹیاں کچّا پکّا گوشت، کھٹّے میٹھے پھل اور مختلف قسم کی مٹھائیاں ایک فاقہ کش انسان کی طرح جلدی جلدی حلق سے نیچے اتار رہا تھا۔ ہر چیز اس کے معدے میں پہنچ کر ہضم ہوئی جارہی تھی، اس لیے اس کا پیٹ کسی طرح نہ بھرتا تھا۔ وہ برابر کہے جارہا تھا، "میں بھوکا ہوں، میں بھوکا ہوں۔ مجھے کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ میں کیا کروں؟"

نوجوان شکاری نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ اب یہ چار مسافر ہوگئے۔ اور ایک ساتھ شمال کی جانب سفر کرتے رہے۔

پھر انھیں ایک شخص ملا، جس کے کان اتنے لمبے تھے کہ زمین سے لگ رہے تھے، اسی لیے اس کی سننے کی قوت بڑی تیز تھی۔ وہ ہزاروں میل پرے کی باتیں بھی سن لیتا تھا۔ انھوں نے اس کو بھی اپنا ہم سفر بنالیا اور اس طرح ان کی تعداد پانچ ہوگئی۔

پھر انھیں ایک شخص ملا، جس کی ٹانگیں بہت بڑی تھیں اور وہ لمبی لمبی چھلانگیں لگا سکتا تھا۔ وہ بھاری پتھر اٹھا کر اپنی پیٹھ کی طرف پھینکتا اور ان کے زور میں آگے کی جانب زیادہ دور کود سکتا تھا۔ اس طرح وہ اپنی مسافت جلد طے کرلینی جانتا تھا۔ وہ بھی ان کا ساتھی بن گیا اور اب ان کی تعداد کل چھے ہوگئی۔

اس کے بعد جو شخص ملا، وہ بہت ہی عجیب تھا۔ وہ زمین کا ایک کونا پکڑ کر اس طرح ہلادیتا تھا، جیسے زلزلہ آرہا ہو۔ ہر چیز تھرا کر رہ جاتی تھی۔ وہ بھی شمال کی جانب جانے والے مسافروں کا ساتھی بن گیا اور اب ان کی تعداد سات ہوگئی۔

یہ ساتوں آدمی چلتے چلتے اس جگہ پہنچے جہاں سات بھائی اپنی ایک خوب صورت بہن کے ساتھ رہتے تھے۔ جب سات بھائیوں نے سات مسافروں کو آتے دیکھا تو لپک کر آگے بڑھے تاکہ انھیں مار بھگائیں، لیکن پھر ہچکچا کر رہ گئے، کیوں کہ مسافر ان کے مقابلے میں زیادہ

قوی اور بھاری بھر کم تھے، اس لیے انھوں نے قریب آکر پوچھا، "تم لوگ کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

صرف شکاری کے بیٹے نے جواب دیا، "ہم تمھاری بہن کو لینے کے لیے آئے ہیں۔ اس ملک کا بادشاہ اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے، تاکہ وہ ہاتھی دانت کے نئے محل میں اس کے ساتھ رہے۔"

سات بھائیوں نے کچھ نہیں کہا، وہ اپنے مکان میں واپس چلے گئے، تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر کوئی منصوبہ بنا سکیں۔ شکاری نے لمبے کان والے ساتھی سے کہا، "بتاؤ، یہ لوگ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔"
اس نے زمین سے کان لگا کر سنا اور بتایا کہ وہ شرط کے طور پر ہمیں کھانے کی سات دیگیں دیں گے اور کہیں گے کہ اگر تم انھیں چٹ کر جاؤ تو ہماری بہن کو ساتھ لے جا سکتے ہو، ورنہ نہیں۔

وہ شخص جو ہمیشہ بھوکا رہتا تھا، یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ چلو اس طرح کچھ پیٹ بھرنے کی صورت نکل آئے گی۔ کچھ دیر میں ساتوں بھائی باہر آئے اور ساتوں مسافروں کو مکان میں لے گئے، جہاں پکے پکائے کھانے کی سات دیگیں بھری رکھی تھیں۔ انھوں نے اپنی شرط بیان کر دی، جو منظور کر لی گئی۔ چھے مسافر ہر لقمہ ذرا رک رک کر کھاتے رہے، لیکن وہ جو بہت بڑا پیٹو تھا، بڑے بڑے نوالے تیزی سے کھاتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ساتوں دیگیں صاف ہو گئیں۔ پھر بھی اس نے بلک کر کہا کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ اور ہو تو لے آؤ، میں تو ابھی تک بھوکا ہوں۔

لیکن سات بھائی اپنی بہن کو کسی طرح اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے کہا، "ایک آزمائش اور ہوگی۔" چناں چہ انھوں نے پانی کے سات بڑے پیپے بھر کر ان کے سامنے رکھ دیے اور کہا کہ تمام پانی ایک دم پی جاؤ، لہٰذا ہر وقت پیاسا رہنے والا مسافر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ سب نے تو ایک ایک دو دو گھونٹ لیے اور وہ پورے پورے جگ پیتا رہا، یہاں تک کہ پیپے بالکل خالی ہو گئے۔ پھر بھی وہ چلّاتا رہا، "ہائے پیاس لگ رہی ہے۔ ہائے لگ رہی ہے۔ ہائے پیاس لگ رہی ہے۔ میرا گلا خشک ہوا جا رہا ہے۔"

پھر سات بھائیوں نے ایک اور تدبیر سوچی۔ انھوں نے کہا، "اگر تم میں سے کوئی شخص کھولتے ہوئے گرم پانی میں

ڈبکی لگالے تو ہم تمھارے قائل ہو جائیں اور اپنی بہن تمھارے حوالے کر دیں۔" چناں چہ وہ جو سردی کے مارے کپکپا رہا تھا، اس آزمائش کے لیے تیار ہو گیا اور کام یاب رہا، بلکہ وہ اس کھولتے ہوئے پانی سے باہر آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

تب سات بھائیوں نے کہا، "بے شک! تم اس وقت تک ہر آزمائش میں پورے اترے ہو، لیکن اب ہم ایک ایسی شرط پیش کرتے ہیں، جو تم پوری نہیں کر سکو گے۔ سنو، پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور ہے۔ تم میں سے ایک شخص وہاں جاکر پانی کا گھڑا بھر لائے۔ میری بہن بھی اسی وقت جاکر اسی چشمے سے پانی لائے گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ پہلے کون واپس آتا ہے۔ اگر میری بہن کی واپسی پہلے ہوئی تو تم آئندہ اس کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکو گے۔ تمھیں مایوس ہو کر لوٹ جانا پڑے گا۔"

چناں چہ یہ شرط بھی منظور کر لی گئی، اور یہ کام لمبی چھلانگیں مارنے والے کے سپرد کیا گیا۔ وہ اپنے خاص طریقے کے مطابق چشمے کی طرف چل پڑا اور جب پانی کا گھڑا بھر کر واپس آرہا تھا تو آدھے راستے میں سات بھائیوں کی خوب صورت بہن جاتی ہوئی ملی، لیکن وہ اس مسافر کو دیکھ مسکرائی اور کہا کہ آؤ، کچھ دیر سائے میں بیٹھ کر باتیں کریں۔ لمبی چھلانگیں مارنے والا اس کے کہنے میں آگیا اور وہ دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مسافر بہت جلد سو گیا اور لڑکی نے چالاکی سے مسافر کے گھڑے کا پانی اپنے گھڑے میں بھر لیا اور گھر کی طرف لوٹ گئی۔

جب اندازے سے زیادہ وقت گزر گیا تو شکاری کے بیٹے کو کسی قدر تشویش ہوئی اور اس نے لمبے کانوں والے ساتھی سے کہا کہ تم اپنے کان زمین سے لگاکر سنو کہ ہمارا ساتھی کس سے باتیں کرتا رہ گیا ہے۔ اسے اب تک لوٹ آنا چاہیئے تھا۔ لمبے کانوں والے نے سن کر بتایا کہ وہ درخت کے سائے میں لیٹا خراٹے لے رہا ہے۔ اس کی نیند بہت گہری معلوم ہوتی ہے۔

تب شکاری نے اپنے اس ساتھی سے جو زمین کو ہلا دینا جانتا تھا، درخواست کی کہ تم فوراً زلزلے کی مانند زمین کو ایک ایسا جھٹکا دو کہ ہمارا ساتھی چونک پڑے: چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ جب وہ سو کر اٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پانی کا گھڑا خالی ہے اور لڑکی غائب ہو چکی ہے۔ وہ اس چال بازی کو سمجھ گیا،

لیکن زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ وہ فوراً اٹھا اور اپنی خاص ترکیب کے مطابق بہت جلد چشمے پر دوبارہ پہنچا اور گھڑا بھر کر لڑکی سے پہلے اس کے مکان پر آگیا۔

اس طرح یہ بازی بھی جیت لی گئی۔ اب سات بھائیوں کے پاس کوئی عذر پیش کرنے کی گنجائش نہیں تھی، لہٰذا انھوں نے اپنی بہن کو مسافروں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ جب یہ قافلہ شاہی محل پر پہنچا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور وزیر پہلے کی طرح جل بھن کر کباب ہوگیا، لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

لڑکی نے بادشاہ کی طرف دیکھا، وزیر کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھی دانت کے محل کی طرف دیکھا اور بادشاہ سے پوچھا، "اتنی مقدار میں ہاتھی دانت کون لایا؟"

بادشاہ نے جواب دیا، "شکاری کا بیٹا۔"

"اور یہ محل کس نے تعمیر کیا؟"

"شکاری کے بیٹے نے۔"

"اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر شمالی پہاڑیوں کا راستہ طے کرکے مجھے یہاں تک کون لایا؟"

"شکاری کا بیٹا۔"

"تو جب ہر کام شکاری کے بیٹے نے کیا ہے تو میں اسی سے شادی کروں گی۔ کوئی اور مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔"

پھر اس لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی، "اے خدا! تو اس وزیر کو، جس کی نیت خراب ہے، چوہے میں بدل دے اور اس بادشاہ کو جو دوسروں کی خدمات سے خود فائدہ اٹھاتا ہے، بلّی بنا دے اور ایسا کر کہ بلّی ہمیشہ چوہے کے پیچھے بھاگتی رہے۔"

چناں چہ یہی ہوا اور آج تک ہو رہا ہے۔ بلّی چوہے کے پیچھے بھاگتی رہتی ہے۔

اور جب ملک میں نہ بادشاہ رہا اور نہ وزیر، تو لوگوں نے اتفاق رائے سے شکاری کے بیٹے کو اپنا بادشاہ منتخب کرلیا۔ نئے بادشاہ نے سات بھائیوں کی خوب صورت جوان بہن سے شادی کرلی اور محل میں رہنا شروع کردیا۔ باقی چھے مسافر اس کے وزیر بن گئے اور وہ سب بھی ہاتھی دانت والے محل کے اندر الگ الگ رہنے لگے۔

"بچے آخر بچے" ہیں

لیکن ماں باپ

ان کی جانب سے لاپرواہی ہرگز نہیں برت سکتے

اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر کسے نہیں ہوتی لیکن محض فکرمند رہنا کافی نہیں — اپنی محبت اور شفقت کو عملی جامہ پہنائیے اور اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم، شادی بیاہ اور کاروبار کے لئے ابھی سے روپیہ بچائیے — آج ہی امریکن لائف کی جووینائیل پالیسی حاصل کیجئے۔

تفصیلات ہم سے بذریعہ ڈاک یا ہمارے
کسی نمائندے سے بالمشافہ حاصل کیجئے

امریکن لائف انشورنس کمپنی

(یو-ایس-اے میں ۱۹۲۱ء میں تشکیل شدہ۔ کمپنی کی ذمہ داری محدود)
بالائی منزل، محمدی ہاؤس۔ میکلوڈ روڈ۔ کراچی

سلامت رہے یہ ہاتھ

اخبار نونہال

نئے سال کا خیر مقدم!

ذرا اس کارٹون کو غور سے دیکھو اور سمجھو! جب تم سمجھ لو تو پھر اس کا عنوان سوچو۔ عنوان ایک کاغذ پر لکھ کر ہمیں بھیج دو۔ صحیح عنوان لکھنے والے نونہال کو ایک اچھی سی کتاب انعام میں دی جائے گی۔ ایک سے زیادہ صحیح عنوان آنے کی صورت میں انعام کے لیے قرعہ ڈال کر ایک نام نکالا جائے گا۔

صحت مند نونہال

اس صفحہ پر ہر ماہ صحت مند نونہالوں
کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔
جلدی سے اپنی تصویر بھیج دو!

ریحانہ کوثر، حیدرآباد

شہناز پروین، کراچی

غلام حیدر رامین، لندن

خالد خلیل نعمانی

ذرا تم بھی تو مدد کرو

ان تینوں شکاریوں میں سے ہر ایک کا خیال ہے کہ یہ مچھلی اس کے کانٹے میں پھنسی ہوئی ہے۔ اب تم ہی فیصلہ کرو کہ مچھلی کس شکاری کے کانٹے میں پھنسی ہوئی ہے؟

یہ دو بہنیں اپنی سہیلی اور اس کے بھائی کے لیے تحفے لائی ہیں، مگر وہ دونوں بھائی بہن ان دونوں بہنوں کو دیکھ کر یہیں کہیں چھپ گئے ہیں۔ کیا تم ان دونوں کو تلاش کرنے میں ان دونوں بہنوں کی مدد کرو گے؟

سائیکل کو تھیلے میں رکھ لو!

بتاؤ میں کیا سوچ رہا ہوں

اٹلی کے کارخانہ داروں نے عورتوں کے لیے ایک ایسی سائیکل بنائی ہے، جو تھیلے میں رکھی جا سکتی ہے۔ یہ ان عورتوں کے لیے خاص طور پر کارآمد ہے جو دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ دفتر پہنچ کر وہ اس سائیکل کو موڑ کر تھیلے میں رکھ سکتی ہیں۔ اس سائیکل کا نام "گرازیلا" رکھا گیا ہے۔

لندن کی صنعتی نمائش میں جب گرازیلا سائیکل کو نمائش کے لیے ایک اسٹال پر رکھا گیا تو برطانیہ کی عورتوں نے اسے بہت پسند کیا۔

گرازیلا کا وزن صرف ۳۶ پونڈ ہے اور قیمت ۳۴ پونڈ۔

اسکوٹر کے ساتھ بچہ گاڑی

بچہ گاڑیاں ہر جگہ ہوتی ہیں اور ہر قسم کی ہوتی ہیں، لیکن آج کل جب کہ مغربی ملکوں میں مائیں اسکوٹروں پر بیٹھنے لگی ہیں تو انھیں اپنے بچوں کو بھی بعض اوقات ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے برطانیہ میں خاص قسم کے اسکوٹر بنائے گئے ہیں، جن کے ساتھ بچہ گاڑیوں کو بوقت ضرورت لگایا جا سکتا ہے۔

محبت ہے یا شرارت

ہمارے چینی مہمان

نومبر ۱۹۶۴ء کے شروع ہفتے میں دنیا کے سب سے بڑی آبادی کے ملک اور پاکستان کے پڑوسی چین کے نائب وزیرِ صحت، جناب چی این سن چنگ اور ان کے چار ساتھی پاکستان کے دورے پر تشریف لائے۔ اسلام آباد، راولپنڈی، لاہور اور ڈھاکہ کے مختلف طبی مراکز انھوں نے دیکھے۔ کراچی کے ہوائی میدان پر انجمن ترقیٔ طب کی طرف سے حکیم محمد سعید دہلوی نے صحیّ وفد (ہیلتھ ڈیلی گیشن) کا خیر مقدم کیا، اور ایک سال کے بعد یہ چینی اور پاکستانی دوست پر تپاک طریق پر بغلگیر ہو گئے۔ سال گزشتہ انجمن ترقیٔ طب کا ایک وفد دورۂ چین پر نومبر ہی میں پیکنگ پہنچا تھا۔

انجمن ترقیٔ طب کا وفد "اتحادِ ثلاثہ" کا اصول اپنے ساتھ لے کر چین گیا تھا، مگر چین میں اس نے یہ اتحادِ ثلاثہ عملی شکل میں دیکھا۔ وہاں حکیم (حاملین طبِ چینی)، ڈاکٹر (حاملین طبِ جدید) اور سائنس داں کمال اتحاد کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اور ان کا واحد اور متعیّن مقصد یہ ہے کہ طب کو جامع بنایا جائے اور معالجے کو کامل بنایا جائے اور ہر حال میں مریض کو مرض کے چنگل سے نجات دلائی جائے۔ ایک عظیم ملک کے عظیم ترمسئلۂ صحت کو حل کرنے کی یہ وہ راہ تھی جو آزادیٔ چین کے فوراً ہی بعد چیرمین ماوزے تنگ نے پوری قوم کے لیے متعین کر دی تھی اور شفا بخشی کے مقدس مشن کی تکمیل پر حکیموں، ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کو لگا دیا تھا۔ آج کے چین نے سب سے پیچیدہ ترمسئلہ — صحت انسانی — کو اسی اتحادِ ثلاثہ کی بدولت حل کر لیا ہے، اور اس اتحادِ ثلاثہ کی برکت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ تحقیق اور ریسرچ کا میدان وہاں وسیع ہو چکا ہے اور اب چین عالم اور دنیائے طب میں محیّر العقول اضافات کرنا چاہتا ہے۔

انسانی صحت ایک نہایت مقدس شے ہے اور اس کا تحفظ اس سے زیادہ مقدس ہے، اور کسی قیمت پر اس کو تنگیٔ قلب اور تنگیٔ نظر پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں عظیم الشان غیر ملکی دواسازوں اور ان کی جدت طرازیوں اور محکمہ ہائے متعلقہ پاکستانیہ کی طرف سے ان کی فراخ دلانہ ہمت افزائیوں کے باوجود اور محکمہ ہائے صحت کی سرگرمیوں اور عالمی ادارۂ صحت (ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن) کی اعانتوں کے باوصف ہمارا مسئلۂ صحت کیوں الجھتا جا رہا ہے؟

کیا یہ صحیح ہے کہ ہمارے محکمہ ہائے صحت فنی تعصب کے مرضِ مہلک میں گرفتار ہیں؟

کیا یہ درست ہے کہ حاملین طبِ جدید (جن کو حکومت کی زبردست سرپرستی حاصل ہے) وسیع النظر نہیں ہیں؟

کیا یہ بجا ہے کہ حاملینِ طبِ مشرقی وسیع القلبی کا مظاہرہ نہیں کرتے؟

حالات خواہ کچھ ہی ہوں، ہمیں مریض کی صحت کو ہر حال میں اوّلیت دینی ہو گی۔ اور اپنے نقطہ ہائے نظر کو تعصبات، تنگ نظری اور تنگیٔ قلب کی آلائشوں سے پاک کر کے پاکستان کی خدمت کرنی ہو گی۔ ہم ایسا نہیں کریں گے تو کل آنے والی قوت ہم کو اتحادِ ثلاثہ کے لئے مجبور کرے گی اور تعصب کو جرم قرار دے گی۔

چینی صحتی وفد مطب ہمدرد میں۔ جناب میجر حسین (بائیں) وفد کو مختلف امراض کے بارے میں مطب ہمدرد میں لی ہوئی تصاویر سے بتا رہے ہیں۔ وزیر صحت چین چی این سن چنگ (دائیں جانب) بیٹھے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ ہائی جین اینڈ میڈیکل ریسرچ میں۔

چینی صحتی وفد کے اعزاز میں انجمن ترقی طب کی طرف سے "گارڈن پارٹی" کا ایک منظر۔ اس موقع پر کراچی کے معزز حکما، محترم ڈاکٹروں، سرجنوں اور سائنس دانوں نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے فنی تعصب کو پارہ پارہ کر دیا۔ حکیم محمد سعید دہلوی نے چینی زبان میں تقریر کی اور وفد کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اتحادِ ثلاثہ کے موضوع پر چین کی مثال کو اپنانے پر زور دیا۔

جناب نائب وزیر صحت چین ۔ حکیم محمد سعید دہلوی ۔ جناب اوانگ چنگ

چینی وفد ہمدرد ریسرچ لیبوریٹری میں جہاں یرقان کی یقینی دوا "اکٹرین" اور جریانِ خون رحمی کی موثر دوا "مینوتات" وجود میں آئیں۔

۱۱ ر نومبر ۶۴ء کو ہمدرد لیبوریٹریز میں جدید آئرن ٹانک "فیری سیرا" کی رسم بسم اللہ، نائب وزیر صحت چین کے ہاتھوں۔

دوا اور ایسی مزیدار! اراکین وفد خمیرۂ ہمدرد سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

خودکار مشینیں مقررہ تعداد میں شیشیوں میں قرص بھر دیتی ہیں۔ جناب ایم۔ وائی۔ خان (دائیں) نائب وزیر صحت (درمیان میں) کو سعالین کے بارے میں کچھ بتا رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس (رکن فارماسیوٹیکل ایڈوائزری کونسل آف ہمدرد) (بائیں جانب

بچّوں کی گاڑی

یہ گاڑی جو چھوٹے بچوں کو گھٹنوں چلنا سکھاتی ہے اور معذور بچّوں کو پھر سے کام کرنے کی عادت ڈالتی ہے۔ معذور بچوں کے اعضا کو پھر سے کام کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اس گاڑی کو قد کے مطابق اونچا نیچا کیا جاسکتا ہے۔

مرغی نے ساڑھے سات تولے کا انڈا دیا:

راولپنڈی (۲۴ دسمبر ۶۴ء) اسلام آباد میں ایک دیسی مرغی نے ایک غیر معمولی حجم اور وزن کا انڈا دیا ہے۔ یہ مرغی محمد صدیق الرحمٰن صاحب بھوئیا کے پاس ہے۔ بھوئیا صاحب ان دنوں وزارت اطلاعات و نشریات میں اسسٹنٹ فینانشل ایڈوائزر ہیں اور گزشتہ تقریباً ایک سال سے اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ عام قسم کی دیسی مرغی ہے جو انھوں نے راجہ بازار راولپنڈی سے خریدی تھی۔ اس نے پہلے تو عام قسم کے انڈے دیے پھر ایک روز سات تولے کا انڈا دیا اور اس سے تیسرے روز ساڑھے سات تولے کا انڈا دیا۔ محکمۂ افزائشِ حیوانات کے افسران کا کہنا ہے کہ اس علاقہ میں کسی دیسی مرغی نے آج تک اتنا بڑا انڈا نہیں دیا۔ بھوئیا صاحب اس انڈے کو کیمیائی تجزیہ کے لیے بھیج رہے ہیں۔
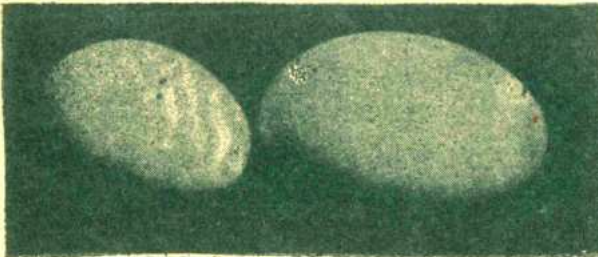
صحت کا مقابلہ

بچّے سب کو اچھے لگتے ہیں، خاص طور پر ہنستے کھیلتے، چاق چوبند اور صحت مند بچّے ہر ایک کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ آج کے بچّے کل کے باپ ہیں۔ یہی بچّے بڑے ہو کر قوم کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ اس لیے شروع ہی سے بچوں کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے اور اپنے ماں باپ کے کہنے پر چل کر اچھی صحت بنانا چاہیے۔

بلدیہ کراچی کا محکمۂ صحت، صحت مند بچّوں کی ہمّت افزائی کے لیے ہر سال "صحت کے مقابلے" کا انتظام کرتا ہے۔ پچھلے سال کے آخر میں بھی کراچی میں "بچّوں کا مقابلۂ صحت" ہوا تھا۔ اس مقابلہ میں ۲۷ بچّوں کو انعامات دیے گئے۔ انعامات مشہور سماجی کارکن محترمہ بیگم اصفہانی نے دیے۔ ذیل میں اور اگلے چار صفحوں پر اسی مقابلۂ صحت کی تصویریں شائع کی جا رہی ہیں۔
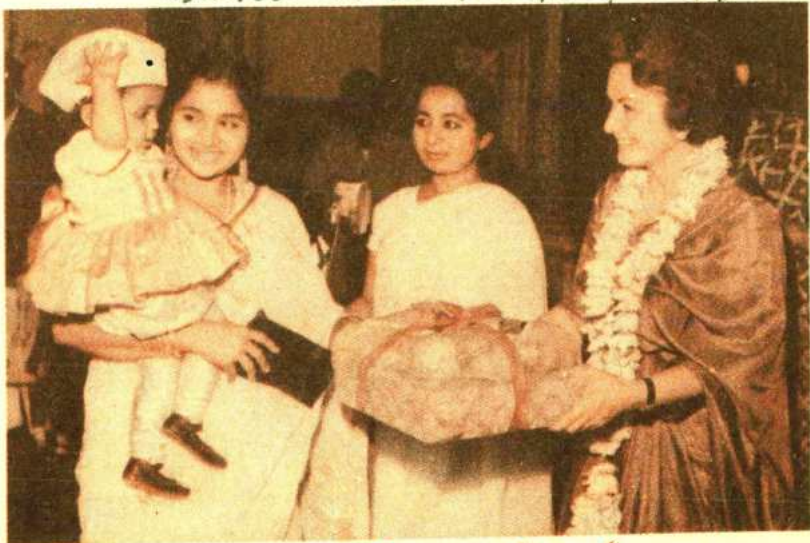
بیگم اصفہانی ایک صحت مند بچّے کو انعام دے رہی ہیں
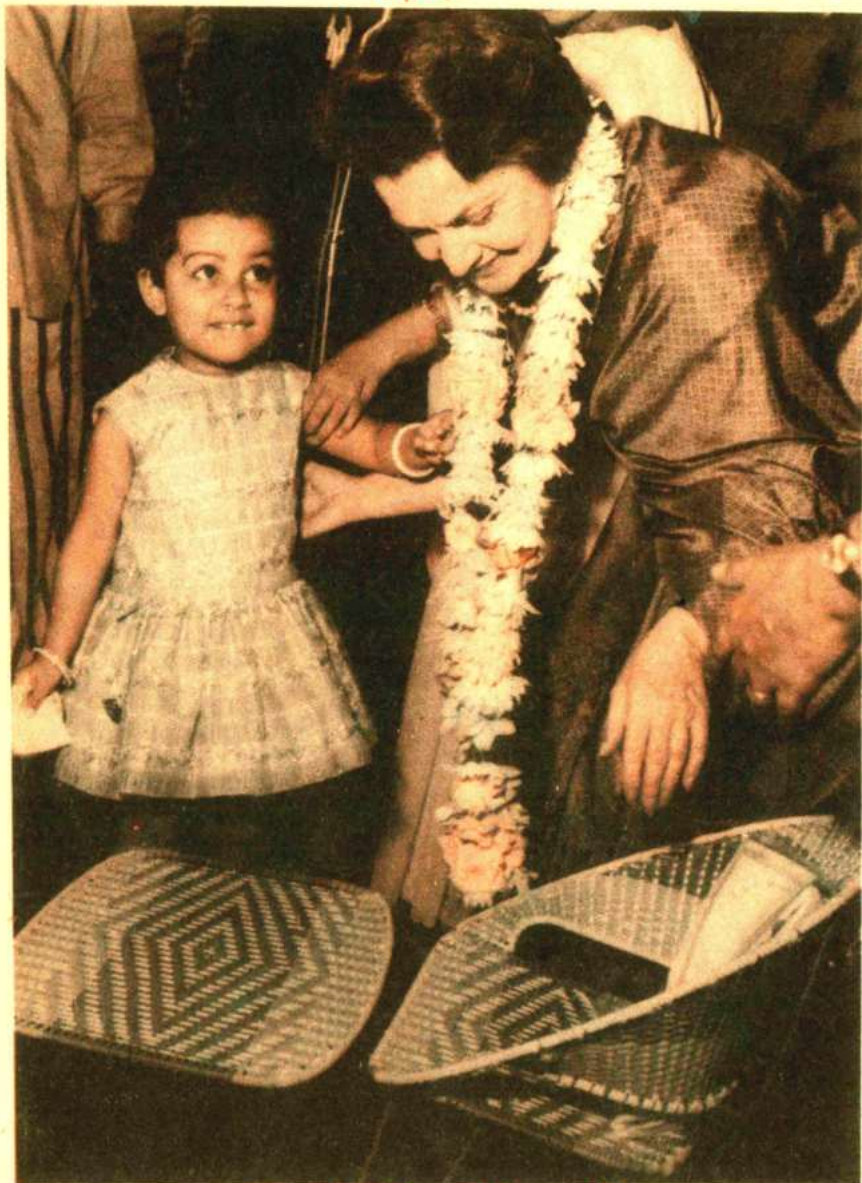
کتنی صحت مند، کتنی پیاری، کتنی خوش ہے یہ بچّی!

دیکھو، کتنی اچھی سائیکل انعام میں ملی ہے۔ تم بھی اپنی صحت کا خیال رکھو۔

اس بچے کو یہ کار انعام میں دی گئی ہے۔

ذرا اس بھولی بھالی بچّی کی حیرت دیکھو۔ شاید اس کو ابھی معلوم
نہیں ہے کہ اچھی صحت اپنی جگہ خود ایک انعام ہے۔

ہم ٹیکس کیوں دیتے ہیں؟

ہر ملک کو اپنی حفاظت کے لیے فوج رکھنی پڑتی ہے۔ بری فوج، بحری فوج، ہوائی فوج۔ ملکی قانون کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے جج رکھنے پڑتے ہیں۔ پولیس رکھنی پڑتی ہے۔ قانون کے خلاف عمل کرنے والوں کے لیے جیل خانے بنانے پڑتے ہیں۔ نقل وحمل کے لیے اچھی سڑکیں بنانی پڑتی ہیں۔ تعلیمات کے لیے، مالیات کے لیے، حفظانِ صحت کے لیے زراعت کے لیے، ریلوں اور ڈاک خانوں کے انتظام کے لیے وزیر مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ ان سب کاموں کے لیے حکومت کو رُپوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ رُپیہ حکومت ہم سے ٹیکسوں کے ذریعہ وصول کرتی ہے۔

اس لیے ٹیکس اُس رقم کو کہتے ہیں، جو کسی ملک کے باشندے اپنے ملک کی حکومت کا خرچ چلانے کے لیے ادا کرتے ہیں۔

کسی ملک کے سارے باشندوں کی آمدنی یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے کسی کی کم۔ اس حقیقت کو نظر میں رکھ کر ٹیکس لگانے پڑتے ہیں۔ جو لوگ مال دار ہیں، اُن سے زیادہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور جو غریب ہیں ان سے کم یا بالکل نہیں۔

مالی مُعاملات کے مشہور ماہر ایڈم اِسمتھ نے ٹیکس لگانے والوں کے لیے ایک اُصول بنایا تھا، وہ اصول یہ ہے:

"ہر ملک کے باشندوں کو
اپنے ملک کی حکومت کی مدد کے
لیے اپنی حیثیت کے مطابق ٹیکس
ادا کرنا چاہیئے، یہ ٹیکس اس
آمدنی کی مناسبت سے قائم ہونا
چاہیے جو ہر شخص حکومت کی
حفاظت میں حاصل کرتا ہے۔"

یہ اصول اچھا ضرور ہے، مگر اس میں ایک خامی ہے۔ اصل میں آمدنی کی مناسبت سے اگر ٹیکس لگایا جائے تو کم آمدنی والوں پر ٹیکس کا بار زیادہ پڑ جائے گا اور مال دار آدمیوں پر بار کم رہے گا۔

اس لیے ٹیکس لگانے کا ایک اور اصول قائم کرنا پڑا، جس پر آج کل دنیا کے قریب قریب سب ملک عمل کر رہے ہیں، وہ اصول یہ ہے:

"ٹیکس اس طرح لگانے
چاہئیں کہ امیر اور غریب کے
درمیان ایثار کی مساوات
قائم رہ سکے۔"

اسی اصول کے مطابق آج کل ہم سب ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ ایک کروڑپتی کو بہت زیادہ ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں، ایک غریب کو بہت کم ٹیکس دینے پڑتے ہیں اور بعض غریبوں کو بالکل ٹیکس دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس شخص کی آمدنی اوسط درجہ کی ہے، اسے ٹیکس بھی اوسط درجے کے دینے پڑتے ہیں۔

ٹیکسوں کی درجہ بندی دو طرح کی جاتی ہے، براہ راست ٹیکس اور بالواسطہ ٹیکس۔

براہِ راست ٹیکس وہ رقمیں ہیں، جو ایک خاص حد سے اوپر آمدنی والے لوگوں سے وصول کی جاتی ہیں۔ یہ ٹیکس براہ راست لوگوں پر لگائے جاتے ہیں۔

بالواسطہ ٹیکس لوگوں پر نہیں، بلکہ چیزوں پر لگائے جاتے ہیں۔ جو لوگ چیزیں خریدتے ہیں، وہ چیزوں کی قیمت کے ساتھ ہی بالواسطہ ٹیکس بھی ادا کر دیتے ہیں اور اکثر لوگ اس سے واقف تک نہیں ہوتے کہ وہ کوئی ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔

براہ راست ٹیکسوں کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا دینا ہے۔ بالواسطہ ٹیکس اتنے پوشیدہ ہوتے ہیں کہ ہم میں سے اکثر ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

براہِ راست ٹیکسوں میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، انکم ٹیکس اور وہ ٹیکس، جو کسی کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ انکم ٹیکس کسی شخص کی آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔ آمدنی کی ایک حد مقرر کردی جاتی ہے کہ جس شخص کی آمدنی اس مقررہ حد سے زیادہ ہوگی، اُسے اِس حساب سے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ جن کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے انھیں بالکل ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ بعض ملکوں میں غیر شادی شدہ آدمیوں پر شادی شدہ آدمیوں سے کچھ زیادہ ٹیکس لگایا جاتا ہے اور اگر بچّے ہوں تو ٹیکس میں کچھ اور رعایت کی جاتی ہے، زیادہ آمدنی والے آدمیوں پر فی صد ٹیکس کی شرح بہ نسبت کم آمدنی والے آدمیوں کے زیادہ ہوتی ہے۔

زیادہ مال دار آدمیوں پر آمدنی کا ایک دوسرا ٹیکس بھی لگایا جاتا ہے، جسے سپر ٹیکس یا زائد ٹیکس کہتے ہیں۔ اس طرح دولت مند لوگوں پر ٹیکس کا بار بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

براہ راست ٹیکسوں میں کچھ اور ٹیکس بھی ہیں، جو لائیسنس ٹیکس کہلاتے ہیں، مثلاً اگر ہمارے پاس موٹر کار ہے تو ہمیں اس کا ٹیکس دینا پڑے گا یا مثلاً جب ہم اپنے پاس بندوق رکھتے ہیں تب بھی ہمیں ٹیکس دینا پڑتا ہے یا اگر ہم شراب یا تمباکو فروخت کرتے ہیں یا بناتے ہیں تب بھی ہمیں ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ یہ چیزیں عیش و عشرت کی حدود میں آجاتی ہیں۔ اگر ہم ان چیزوں کے لیے رُپیہ خرچ کرسکتے ہیں تو ہمیں حکومت کو بھی کچھ رُپیہ دینا چاہیے۔ یہ وہ چیزیں ہیں، جن کے بغیر ہم زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ اگر ہم انھیں استعمال نہ کریں تو ہمیں یہ ٹیکس نہیں دینا پڑے گا۔

ایک اور براہ راست ٹیکس اسٹامپ فیس ہے۔ یہ ان ٹکٹوں کی قیمت کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے، جو دستاویزوں پر لگائے جاتے ہیں۔ جب ہم کوئی مکان خریدتے ہیں یا بیچتے ہیں یا کوئی زمین یا کسی کمپنی کے حصّے خریدتے ہیں یا فروخت کرتے ہیں یا روپیہ قرض لیتے ہیں یا قرض دیتے ہیں تو دستاویز اس وقت تک قانون کے مطابق نہیں ہوسکتی جب تک اس پر اسٹامپ نہ لگائے جائیں۔ یہ اسٹامپ رُپیہ کی تعداد کے مطابق کم یا زیادہ قیمت کے ہوتے ہیں۔

بالواسطہ ٹیکس چیزوں پر لگائے جاتے ہیں، مثلاً چائے، قہوہ، کوکو کا سفوف، شکر، شراب، تمباکو وغیرہ۔ یہ ٹیکس چھپے ہوئے

ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو غور کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو!

چائے پر جو ٹیکس لگایا جاتا ہے، وہ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ فرض کرو ایک ایسا ملک ہے، جہاں چائے پیدا نہیں ہوتی۔ اس ملک کو چائے کسی بیرونی ملک سے درآمد کرنی پڑتی ہے۔ جب چائے بندرگاہ پر پہنچتی ہے تو وہیں درآمدی ٹیکس وصول کرلیا جاتا ہے، اس لیے چائے کے ہر پونڈ کی قیمت اتنی بڑھادی جاتی ہے، جتنا اس پر ٹیکس دیا گیا ہے۔ تھوک فروش جب اس چائے کو خوردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو چائے کی قیمت میں ٹیکس کی رقم شامل کر لیتا ہے۔ اسی طرح جب خوردہ فروش کسی صارف (صرف کرنے یا استعمال کرنے والے) کے ہاتھ چائے فروخت کرتا ہے تو قیمت میں ٹیکس کی رقم شامل کرلیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر صورت میں صارف یا چیز کے استعمال کرنے والے کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ پس ہم کسی دکان سے چائے کا ڈبہ خریدتے ہیں تو ہم صرف چائے کی قیمت ہی ادا نہیں کرتے، بلکہ قیمت کے ساتھ ٹیکس بھی ادا کرتے ہیں۔

ایک غور طلب بات چائے کے ٹیکس میں یہ ہے کہ یہ ٹیکس خریدنے والوں کی حیثیت یا مرتبہ کے اعتبار سے ان پر عائد نہیں ہوتا، جیسے انکم ٹیکس ہوتا ہے، بلکہ غریب امیر سب سے یکساں وصول کیا جاتا ہے۔ جب ایک غریب آدمی ایک پونڈ چائے خریدتا ہے تو وہ بھی اتنا ہی ٹیکس دیتا ہے، جتنا ایک امیر آدمی ایک پونڈ چائے خریدتے وقت دیتا ہے۔ بالواسطہ ٹیکسوں میں یہی ایک سب سے بڑی خرابی ہے، مگر حکومتیں بالواسطہ ٹیکس اس لیے لگاتی ہیں کہ وہ آسانی کے ساتھ وصول کیے جا سکتے ہیں اور ٹیکس دینے والوں کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ ہم ٹیکس دے رہے ہیں۔

شراب پر دو طرح سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ ایک قسم کا ٹیکس تو اس شراب پر عائد کیا جاتا ہی، جو کسی غیر ملک سے درآمد کی جاتی ہے، جیسے اور درآمد کی جانے والی چیزوں پر عائد کیا جاتا ہے۔ یہ درآمدی محصول کہلاتا ہے۔ دوسری قسم اس ٹیکس کی وہ ہے، جو اس شراب پر عائد کیا جاتا، جو خود ملک کے اندر تیار کی جاتی ہے۔ یہ ٹیکس شراب کی بھٹیوں پر لگایا جاتا ہے، یہ ٹیکس ملکی مصنوعات کا محصول کہلاتا ہے۔

جو لوگ شراب نہیں پیتے اور تمباکو کسی شکل میں بھی استعمال نہیں کرتے، انھیں اُن چیزوں پر عائد کئے ہوئے ٹیکس نہیں دینے پڑتے، مگر چائے، شکر، قہوہ، اور دیاسلائی وغیرہ تو سب ہی استعمال کرتے ہیں؛ اس لیے قریب قریب ہر ملک میں عوام بھی بہت ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

یہ تو وہ ٹیکس تھے، جو حکومت ہم پر لگاتی ہے۔ بعض مخصوص ٹیکس میونسپلٹیاں اور کارپوریشنیں اپنا خرچ چلانے کے لیے ہم پر لگاتی ہیں۔ وہ گلیاں اور سڑکیں بناتی ہیں اور ان کی مرمّت کرتی رہتی ہیں، وہ سڑکوں پر روشنی کرتی ہیں، گندی نالیوں کی صفائی کا انتظام کرتی ہیں، ان سب کاموں کے لیے انھیں رُپیہ کی ضرورت ہوتی ہے، جو وہ مکانوں اور تجارتی اداروں پر ٹیکس لگا کر وصول کرتی ہیں، وہ نلوں کے ذریعے پانی مہیا کرتی ہیں اور پانی کا ٹیکس لیتی ہیں۔ مکان کا ٹیکس مکان کی حیثیت کے مطابق لگایا جاتا ہے، مکان چھوٹا ہے تو ٹیکس کم ہوگا۔ ٹیکس کے لیے مکان کے کرایہ کی حد مقرر کردی جاتی ہے، اس حد سے کم کرایہ والے مکانوں پر بالکل کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاتا۔

کیلا — ایک گھاس

کیلا گرم و تر ملکوں کا نہایت اہم پھل ہے۔ یہ پرانے زمانے سے چلا آتا ہے۔ انسان نے سب سے پہلے جن پھلوں کی کاشت کی، ان میں کیلا بھی شامل تھا۔ اس کا ذکر چین کی ان کتابوں میں موجود ہے، جو تین ہزار سال پرانی ہیں۔

اگرچہ ہم کیلے کو درخت ہی سمجھتے ہیں اور اس کی اونچائی بعض اوقات تیس فیٹ تک پہنچ جاتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ ایک طرح کی گھاس ہے۔ جس ڈنٹھل پر ایک مرتبہ پھل لگتا ہے وہ مرجاتا ہے اور اگلے موسم میں زمین سے اس کی جگہ ایک نیا ڈنٹھل اگ آتا ہے۔ کیلے کی باقاعدہ کاشت کی جاتی ہے۔ اس کے بیج بھی ہوتے ہیں، لیکن قلم لگانے سے بہتر پودے حاصل ہوتے ہیں۔

کیلوں کو عام طور پر درخت پر نہیں پکنے دیا جاتا، ورنہ وہ پھٹ جاتے ہیں اور کیڑے ان میں گھس کر انھیں خراب کر دیتے ہیں، اسی لیے انھیں کچّا توڑ لیا جاتا ہے اور وہ رکھے رکھے پک جاتے ہیں۔

★

نئی نسل کو پروان چڑھائیے!

بچوں کے پنپتے ہوئے جسموں کو قوت بخش غذا کی ضرورت ہے۔
بانو بناسپتی میں پکائے ہوئے خوش ذائقہ اور قوت بخش کھانے
بچوں کی غذائی ضرورت کو پورا کر کے انہیں
ہمیشہ صحت مند رکھتے ہیں۔

بناسپتی خوبی اور پاکیزگی میں بے مثل ہے

وٹامن اے اور ڈی شامل ہیں

ہاتھوں سے مس کئے بغیر
تیار اور پیک کیا جاتا ہے۔
۲ پاؤنڈ ۵ پاؤنڈ
۱۰ پاؤنڈ اور ۳۵ پاؤنڈ کے
ڈبوں میں ملتا ہے۔

برما آئل ملز لمیٹڈ - کراچی

ڈسٹری بیوٹرز برائے - کراچی - حیدرآباد - سکھر ـــ
محمد علی اینڈ کمپنی جوڑیا بازار - کراچی

BO-21/844 united

کوریا کی لوک کہانی

اُزیر احمد

شہزادی مچھلینہ

SAMI.64

شہزادی مچھلینہ ایک دن صبح کو سویرے ہی سویرے اپنے محل سے تن تنہا سَیر گشت کے لیے نکل کھڑی ہوئیں اور پھر جب سیر و تفریح سے واپس لوٹ رہی تھیں تو محل کے پھاٹک پر ہی انھیں ایک خوب موٹا تازہ رس بھرا کیڑا نظر آیا، جو ترنگ میں آ کے بس ناچے ہی جا رہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اس موٹے شکار کو دیکھ کر شہزادی صاحبہ کے منھ میں پانی بھر آیا اور انھوں نے ایک لمحہ دیر کیے بغیر غپ سے اس کو نگل لیا لیکن یہ کیا؟ اس کیڑے کے اندر کوئی کانٹا چھپا ہوا تھا، جو ان کی ناک میں پھنس گیا اور اب نہ تو وہ گھر ہی جا سکتی تھیں، کیوں کہ وہ چھوٹا سا کانٹا کسی ڈور کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور نہ مدد کے لیے کسی کو آواز دے سکتی تھیں، کیوں کہ کانٹا ناک میں اس طرح پھنسا تھا کہ آواز تک نہیں نکل سکتی تھی، لیکن ان کی حفاظت کے لیے جو خاص دستہ مچھلیوں کی ملکۂ عالیہ نے مقرر کر رکھا تھا، وہ تو دیر سے ہی ان کی تلاش میں نکل چکا تھا اور ان کی ناک سے رِس رِس کر نکلنے والے خون کی مہک اور اس کے نشان پر وہ جلد ہی اپنی شہزادی صاحبہ کے پاس پہنچ گیا اور اس ڈور کو کسی نہ کسی طرح توڑ کر انھیں فوری طور پر مصیبت سے چھڑا لیا، لیکن ان کی ناک میں اٹکا ہوا کانٹا پوری کوشش کے باوجود

وہ نہ نکال سکے۔
کانٹے کے زخم سے شہزادی مچھلینہ سخت بیمار ہوگئیں اور جب کسی طرح کوئی فائدے کی صورت نظر نہ آئی تو ایک دن پان نگر کے تمام بڑے بڑے معالجوں، محل کے تمام افسروں اور یہاں بسنے والوں کے نمائندوں اور لیڈروں کی کانفرنس محل کے ایک خاص کمرے میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں تمام شرکت کرنے والوں کے چہروں کی سنجیدگی اور ان سے ظاہر ہونے والی پریشانی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سب شہزادی مچھلینہ کی اس بیماری سے کتنے گھبرائے ہوئے ہیں اور ان کی کتنی خواہش ہے کہ علاج کا بہتر سے بہتر طریقہ جلد سے جلد معلوم کرلیا جائے، لیکن اس سلسلے میں کام یابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر کار جب کچھوے کے سردار سے اس مسئلے پر رائے لی گئی تو اس نے بہت سوچ بچار کے بعد کہنا شروع کیا،
"میرے دادا جان قبلہ نے ایک ایسی ہی بیماری سے میری دادی جان محترمہ کو محض چند دنوں میں اچھا کردیا تھا اور وہ اس طرح کہ خرگوش کی تازہ کلیجی کی پُلٹِس تیار کرکے دن میں دو تین بار لگادی جاتی تھی۔ تین چار دن کے اندر ہی اندر ہماری دادی جان بھلی چنگی ہوگئی تھیں۔"
کچھوے کے مشورے پر بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا گیا اور تمام حاضرین نے، جس میں مچھلی کی حکومت اور پانی نگر کے تمام قابل ترین ڈاکٹر بھی شامل تھے، اِس علاج کو بہت پسند کیا، مگر مشکل یہ تھی کہ شہزادی مچھلینہ کے علاج کے لیے خرگوش کی تازہ کلیجی کہاں سے اور کس طرح حاصل کی جائے، لیکن اس مشکل مسئلے کا حل بھی کچھوے نے ہی پیش کیا۔
"میں اکثر سمندر کے کنارے ٹہلنے جایا کرتا ہوں۔ وہیں میری ملاقات ایک خرگوش سے ہوگئی اور اب ہم لوگ دوست بن گئے ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح بہلا پھسلا کر اپنے خرگوش دوست کو شہزادی صاحبہ کے محل میں تو لا سکتا ہوں، لیکن اس کے بعد تمام کام معالج صاحبان کو کرنا پڑے گا، کیوں کہ میری کم زور طبیعت کو خون وغیرہ دیکھ کر سخت وحشت ہوتی ہے۔"
محل کے افسروں اور مچھلیوں کی ملکۂ عالیہ کے خاص نمائندے نے کچھوے کے مشورے اور اس کی پیش کش کا شاہی

طریقے پر شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد کچھوا خراماں خراماں سمندر کے ساحل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس دن سخت گرمی پڑ رہی تھی ۔ جب موٹا کچھوا ہانپتا کانپتا اور لمبے لمبے سانس لیتا ہوا سمندر کے کنارے پہنچا لیکن قسمت اچھی تھی، اس لیے خرگوش سے جلد ہی ملاقات ہوگئی ۔ کچھوے کو دور سے دیکھتے ہی خرگوش بھاگ کر کسی محفوظ جگہ پر چھپ گیا، لیکن جب یقین ہوگیا کہ آنے والا اس کا دوست کچھوا ہے تو وہ وہاں سے نکل کر باہر آیا اور صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد پوچھا" ارے بھائی کچھوے، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

" میں بس سیر و تفریح کے خیال سے اِدھر نکل آیا تھا" کچھوے نے جواب دیا، " میں نے سنا تھا کہ اس پہاڑی سے سمندر کا منظر بڑا شان دار نظر آتا ہے، لیکن آج معلوم ہوا کہ جس قدر تکلیف اور پریشانی میں نے اس سلسلے میں اٹھائی ہے، اس کے لحاظ سے یہ نظارا بالکل ہی معمولی اور پھیکا سا تھا"

" میرے دوست! بھلا یہاں پہاڑی کے دامن سے سمندر کیا خاک اچھا نظر آئے گا" خرگوش نے کہا، جس کو بڑی فکر اس بات کی تھی کہ کچھوے کو پہاڑی کی چوٹی پر لے جا کر سمندر کا منظر دکھایا جائے۔ " اگر تم واقعی اس کا اصلی لطف اٹھانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں پہاڑی کی چوٹی پر لے چلتا ہوں۔ پھر اگر وہاں سے واپس آنے کو تمھارا دل چاہے تو میرا نام بدل دینا"

" نہیں بھئی، بہت بہت شکریہ!" کچھوے نے کہا، " میں نے تمھاری پہاڑی کی خوب سیر کرلی۔ مجھے تو اپنی پانی کی دنیا ہی پسند ہے۔ میرے دوست، کبھی تم وہاں کے شان دار مناظر دیکھو، کیسے کیسے سدا بہار ہرے ہرے جنگل اور باغ ہیں اور ان میں ایسے ایسے خوش رنگ پھول اور مزے مزے کے پھل ہیں اور ان کی وادیوں اور غاروں میں رنگ برنگی مچھلیاں ہر وقت رسیلے گیت گاتی اور پیارے پیارے ناچ ناچتی رہتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی تکلیف کے بغیر پانی تمھیں اِدھر اُدھر لیے پھرتا ہے۔ اب بھلا بتاؤ تو ان سب چیزوں کے مقابلے میں تم اس گرم

اور سُوکھی پھیکی زمین پر مجھے کیا چیز دکھاؤ گے۔"
یہ کہہ کر کچھوا تو سمندر کی طرف تیز تیز قدم سے چلنے لگا۔ خرگوش نے پہلے تو وہیں پر کھڑے ہو کر کچھ سوچا، مگر کچھوے کی چکنی چپڑی باتوں کا جادو اس پر چل چکا تھا، اس لیے بھاگ کر وہ اس کے پاس پہنچا اور ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا "پانی کے اندر کسی طرح کی تکلیف تو نہیں ہوتی اور پانی آنکھ، ناک اور منہ کے اندر تو نہیں گھستا ہے نا؟"

"نہیں نہیں نہیں مسٹر خرگوش نہیں، سمندر میں پانی ویسے ہی ہے، جیسے خشکی پر ہوا۔ تم بغیر کسی مشکل کے فوراً ہی اس کے عادی ہو جاؤ گے۔" کچھوے نے بہت ہشیاری سے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے خرگوش کو سمجھایا۔

"میرا دل تو بہت چاہتا ہے کہ میں بھی تمھارے پانی کی عجیب و غریب دنیا کی سیر کروں!" خرگوش نے کہا" لیکن شاید میں وہاں پانی کے اندر مچھلیوں کی طرح سانس نہیں لے سکوں گا۔"

"کیا حماقت کی بات کرتے ہو مسٹر خرگوش!" کچھوے نے کہا" ارے بھائی! پانی کے اندر سانس لینے کے متعلق تم کو کیوں شبہ ہے؟ اب اگر تم واقعی سمندر کے اندر مچھلیوں کی حکومت کی سیر کرنا چاہتے ہو تو بِلا تکلف میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی چند منٹوں میں تم کو وہاں پہنچا دوں گا۔"

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد خرگوش نے کچھوے کی دعوت قبول کر لی اور سمندر کے کنارے پہنچ کر وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور پھر دونوں پانی کے اندر کی دنیا میں چلے گئے۔ خرگوش اس جگہ کی شان دار چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ جلد ہی خوش رنگ اور خوب صورت مچھلیوں نے، جو اس کے انتظار میں وہاں کھڑی ہوئی تھیں، اس کو بیمار شہزادی کے محل میں پہنچا دیا، جہاں اس ملک کے بڑے بڑے افسروں اور قابل ترین معالجوں نے اس کو خوش آمدید کہا، لیکن ابھی وہ سمندری گھاس کی بنی ہوئی ایک بہت ہی شان دار کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کو قریب ہی کہیں بات چیت کی آواز سنائی دی جس کا مطلب یہ تھا کہ خرگوش کی کلیجی جلد از جلد نکالنے کا آسان طریقہ کیا ہے؟

اب اس بے چارے کی گھبراہٹ اور پریشانی کا جو عالم ہوا ہوگا، اس کا اندازہ تو تم لگا ہی سکتے ہو۔ اس نے ایک بہت ہی ننھی سی خوب صورت مچھلی سے بات چیت

کرکے یہ اندازہ لگا لیا کہ کس طرح جال بچھا کے اس کو یہاں لایا گیا ہے اور سیر و تفریح کے پیچھے اصل میں کون سا مقصد ہے۔ اس نے بے بسی کی حالت میں سر کھجا کھجا کے سوچنا شروع کیا کہ کوئی ایسی ترکیب ہو سکتی ہے، جس سے وہ یہاں سے زندہ سلامت بھاگ نکلنے میں کام یاب ہو جائے، تب یک بہ یک اس نے بڑبڑانا شروع کیا، "خدا اسی کی مدد کرتا ہے، جو خود اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ خواہ مخواہ کو بے وقوف بن جائیں گے۔" اور پھر اس نے محل کے افسروں اور معالجوں کو یہ یقین دلانا شروع کیا کہ جس طرح لوگ ضرورت کے وقت چشمہ پہن لیتے ہیں اور پھر اتار کر رکھ دیتے ہیں، اسی طرح زمین پر رہنے والے پیٹ کے اندر سے کلیجی نکال لیتے ہیں اور کبھی کبھی مہنگے داموں پر بیچ بھی دیتے ہیں۔ اس خیال سے کہ پانی کے اندر بھیگ نہ جائے، اس نے یہاں آنے سے پہلے اپنی کلیجی نکال کر سمندر کے کنارے ایک پتھر کے نیچے رکھ دی تھی اور پھر اس کے بعد کچھوے کی پیٹھ پر بیٹھا تھا۔" اس نے کہا، "بڑی خوشی سے میں شہزادی مچھلینہ کی اس بیماری کے علاج کے لیے اپنی کلیجی پیش کرنے کو تیار ہوں۔ زمین کے ایک ادنا شہری کی حیثیت سے میں اس کو بہت بڑی خوش قسمتی اور عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے تاریخی اپریشن کے لیے ان کے کام آسکوں، لہٰذا اگر مچھلیوں کی ملکۂ عالیہ اجازت دیں تو ابھی بس چند منٹوں میں پتھر کے نیچے سے کلیجی لے آؤں۔" خرگوش کی اس خاکساری سے معالج صاحبان اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں دھوکے سے اس کو اغوا کر کے یہاں پھانس لانے کی حرکت پر شرمندگی ہونے لگی۔ اُن کے خیال میں یہ کام تو محض معمولی سی درخواست پر ہو سکتا تھا، لہٰذا کچھوے کو خوب ڈانٹ پھٹکار کے بعد حکم دیا گیا کہ اس معزز مہمان کو پیٹھ پر بٹھا کر واپس زمین پر لے جائے۔ حکم ملنے کی دیر تھی، فوراً اس پر عمل کیا گیا، لیکن ساحل پر پہنچنے کے ساتھ ہی خرگوش نے اپنے بدن سے پانی کے قطروں کو جھٹک کر صاف کیا اور پہاڑی کی طرف بھاگتے ہوئے کچھوے سے کہنے لگا،

"اب اگر ہمت ہے تو مجھے پکڑ لو۔ ویسے میرے پاس صرف ایک ہی کلیجی ہے اور میں اس کو کسی شہزادی یا ملکہ کے لیے بھی نہیں دے سکتا۔" یہ کہتا ہوا یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

★

کھلے جو موسمِ سرما میں
ایسا پھول بنو!

تبت سنو اور تبت کولڈ کریم آپ کی جلد کو موسمِ سرما کی خشک اور سرد ہواؤں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ان کا باقاعدہ استعمال چہرے کو نیا حُسن اور پھولوں کی سی تازگی بخشتا ہے۔

ایشیا کی
مشہور ترین
بیوٹی کریم

سنو

کولڈ کریم

کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ ڈھاکہ

میرا کیا نام ہے؟

ایچ۔ ایلن اسمتھ   ابنِ حمید ایم۔ اے

پریشان کن صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آپ یہ بھولنے لگیں کہ آپ بھول رہے ہیں۔

کچھ عرصہ گزرا، میں نے لندن کے ایک بوڑھے آدمی ڈیوہرسٹ کے بارے میں مندرجہ ذیل واقعہ سُنا:۔

وہ لندن کی ایک خاتون، لیڈی بیجلے کے مکان پر ایک دعوت میں شریک تھا۔ یکایک وہ اس بھول میں مبتلا ہوگیا کہ یہ دعوت اس کے گھر میں ہورہی ہے اور وہ خود میزبان ہے۔ اس نے لیڈی بیجلے کی طرف مخاطب ہوکر بلند آواز میں کہا، "معاف کیجیے محترمہ، میں خود اس بارے میں بہت پریشان ہوں۔ حقیقت ہے کہ یہ کھانا قابلِ نفرت ہے۔" اس کی میزبان اِس طرح اچھل پڑی، جیسے بھرے مجمع میں کسی نے اس کے منہ پر جوتا کھینچ مارا ہو۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی، ڈیوہرسٹ نے پھر کہنا شروع کیا، "آج کی شب باورچی چھٹی پر ہے اور یہ بیمار کردینے والا ملغوبہ باورچی خانے کی ملازمہ نے تیار کیا ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ مجمع اِکٹھا کرکے سنگ سار کردی جائے۔ میں سفارش کروں گا کہ آپ دسترخوان پر کچھ نہ کھائیں۔"

مجھے نہیں یاد کہ اس کے بعد کیا ہوا، لیکن آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔ مجھے بعد کی باتوں سے دل چسپی نہیں نہ میں اس

واقعے کے دل چسپ پہلو سے لطف اندوز ہوسکا، کیوں کہ مجھے سلسلے وار وہ واقعات یاد آگئے، جو کچھ عرصہ قبل مجھ پر گزرے تھے۔

ایک ہی ہفتے میں دو موقعوں پر مَیں نے اپنے دفتر کو باہر سے تالا لگا دیا۔ چابیاں اندر رہ گئیں اور میں باہر۔ ہر بار مجھے اندر جانے کے لیے شیشے کا ایک تختہ کٹوانا پڑا۔ اور پھر بڑھئی کو بلوا کر دوسرا لگوایا۔ جب وہ دوسری بار آیا تو میں اس کی تحقیر آمیز نظروں کی تاب نہ لا سکا۔

اسی زمانے میں بارہا ایسا ہوا کہ مَیں نے فون پر کوئی نمبر ملایا۔ جب دوسری طرف سے فون اٹھایا گیا تو میں یہ بھول گیا کہ کس کو فون کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ گفتگو میں مجھے کتنی شرمندگی کا سامنا ہوتا ہوگا، لیکن میں حتی الامکان رسمی کھوکھلی ہنسی کی آڑ لے کر یاد داشت کی خرابی کے تذکرے اور معذرت کے بجائے یہ کہہ دیتا، شاید میں نے غلط نمبر استعمال کرلیا! اور فون رکھ دیتا۔

اس کے کچھ بعد ایک عورت کا خط آیا، جس میں اس نے ایک خدمت میرے سپرد کی تھی۔ یہ خط میری میز پر کچھ کاغذات کے نیچے دب گیا اور ایک مہینہ گزر گیا۔ جب دوبارہ اس خط پر نظر پڑی تو معذرت کے لیے میں نے اس عورت کو فون کیا ــــــ مگر میری بات کاٹتے ہوئے اس نے جواب دیا "آپ نے تو میرے خط کا جواب دیا تھا اور یہ بہت معقول جواب تھا۔"

اب مجھے یقین ہوگیا کہ میرا بھیجا پکّے ہوئے ٹماٹر کی طرح سڑ رہا ہے۔ اسی تشویش کے دوران ایک روز ڈاکٹر فرڈی ننڈ ویک نے مجھے اور میری بیوی کو مدعو کیا۔ ڈاکٹر ویک بہت ذہین اور لائق فائق انسان، اچھا سرجن اور عملی نفسیات کا ماہر ہے۔ اس کے ساتھ مجھے کئی گھنٹے گزارنے اور تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع بھی ملا۔ میں نے اس سے اپنی بھول کے واقعات بیان کیے۔

ڈاکٹر نے بڑے سکون اور ہمدردی سے سُنا اور جو بات کہی، وہ بڑی ہمّت افزا اور عجیب تھی۔ اس نے کہا "آپ کا معاملہ بالکل آسان ہے اور اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں۔ جب تک آپ کو غائب دماغی کا احساس ہوتا رہے، آپ غائب دماغی کے مریض نہیں ہیں۔ جب یہ احساس جاتا رہے، تب سمجھیے کہ مصیبت آپڑی۔"

ڈاکٹر نے چند عظیم تاریخی شخصیتوں کی

بھول کے واقعات بیان کیے۔ مشہور انشا پرداز
جی۔ کے۔ چسٹرٹن اکثر رسائل کی دکان سے اپنا
ہی رسالہ خرید لیتا تھا۔ کبھی اپنے دفتر کا راستہ
پوچھتا پھرتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی بیوی
کو تار دیا، "میں ہاربورڈ مارکیٹ میں ہوں۔ مجھے
اس وقت کہاں ہونا چاہیے تھا۔"

ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر
ویک نے کہا، "ٹامس ایڈیسن ایک بار ٹیکس ادا
کرنے کے لیے لائن میں کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ
کھڑکی پر پہنچا تو اپنا نام بھول گیا۔ اس نے
اپنے پیچھے والے شخص سے پوچھا، "مہربان من،
کیا آپ بتا سکیں گے کہ میں کون ہوں؟"
اتفاق یہ کہ اس نے نام بتا دیا۔"

بھول کے اِن واقعات نے یہ واضح
کر دیا کہ میری بھول تو اس کے مقابلے میں
قابلِ فخر یاد داشت کہی جا سکتی ہے، لیکن مجھے
اس نفسیاتی تجزیے کے علاوہ اور بھی اخلاقی
سہارا ملا۔ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر یہ
طے ہوا کہ گاؤں تک چلیں اور کچھ شام کے
اخبارات خریدیں۔ کار چلاتے ہوئے ڈاکٹر نے
یکایک کہا، "یہ چیز آج کل بہت عام ہوگئی ہے۔"

"کیا چیز؟" میں نے کہا۔

"اوہ ... میں بھول گیا۔ ہم کس
موضوع پر بات کر رہے تھے؟" ڈاکٹر بولا۔

"غائب دماغی کے بارے میں"۔ میں نے
جواب دیا۔

ڈاکٹر نے کہا" ہاں ہاں، میں اسی کے
بارے میں بتا رہا تھا کہ آج کل بہت عام ہوگئی ہے۔"

ہم نے اخبارات خریدے اور واپس
ہونے ہی والے تھے کہ ڈاکٹر نے کچھ یاد کرتے
ہوئے زیرِ لب کہا،" اس نے کیا لانے کو
کہا تھا.... لاحول ولاقوۃ —— یاد نہیں
آتا۔" کچھ دیر وہ پیشانی کو ٹھوکے دیتا رہا،
پھر خوش دلی کے ساتھ بولا، "چھوڑیے۔
آیئے چلیں۔" راستہ میں ایک دکان پڑی۔
ڈاکٹر یک بیک رک گیا، "دیکھیے یاد آگیا۔"
وہ کار سے اترا، سلائی کی مشین کے لیے
تیل کی ایک شیشی خریدی اور واپس آگیا۔

گھر آکر اس نے شیشی اپنی بیوی
کے حوالے کی۔ بیوی نے کہا،" میں نے
تو ایک پاؤ مکھن کی آئس کریم منگا ئی
تھی۔"

معلوم نہیں کہ یہ غائب دماغی کا
مظاہرہ تھا یا میری غائب دماغی کا علاج
—— بہرحال میں ٹھیک ہوگیا۔

ٹھنڈی ہواؤں کا نزول، نزلے کا پیش خیمہ ہے

ٹھنڈی ہوائیں چلیں اور لوگ نزلہ، زکام، کھانسی میں مبتلا ہوئے۔
سعالین کا بروقت استعمال آپ کو ان بلاؤں سے محفوظ رکھے گا۔
یہ ان بیماریوں کا علاج بھی ہے اور ان سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی۔

سعالین

نزلہ، زکام اور کھانسی کے لئے

برنیکس

گلے، ناک اور سینے پر ملنے سے سوزش اور جکڑن دُور ہو کر فوری افاقہ محسوس ہوتا ہے اور مرض کی شدّت بہت حد تک کم ہو جاتی ہے۔

ہمدرد

ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور چٹاگانگ

HSU - 21/883

united

ایک جاپانی کہانی

چاند کی لڑکی

میاکو کا پیشہ بانس کاٹنا تھا، وہ بہت غریب آدمی تھا۔ ایک دن بانسوں کے درخت کاٹتے کاٹتے اُسے شام ہوگئی اور اندھیرا چھانے لگا، یکایک اُس کی نظر بانسوں کی جڑوں کی طرف گئی تو اسے وہاں تیز سفید روشنی نظر آئی۔ اس نے غور سے جھک کر دیکھا تو وہاں ایک منّی سی لڑکی پڑی ہوئی تھی، جو مشکل سے چار انچ لمبی ہوگی، لڑکی زندہ تھی اور ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھی۔

غریب بوڑھے آدمی نے اُس لڑکی کو اٹھالیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُسے لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا، اُسے ڈر یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو اس کی بیوی اس لڑکی کو گھر میں نہ رکھے، مگر وہ بھی اس منی سی نورانی لڑکی پر فریفتہ ہوگئی۔ انھوں نے لڑکی کا نام کگویا رکھا۔

یہ لڑکی بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔ جب میاکو بانس کے درخت کاٹنے جاتا تو اُسے بانسوں کی جڑوں میں بہت سونا ملتا۔ ہوتے ہوتے وہ بڑا مالدار ہوگیا۔

اس اثنا میں کگویا کی نشوونما حیرت انگیز طریقہ پر ہوئی، تین مہینے کے اندر اندر وہ خاصی بڑی ہوگئی، وہ اس قدر خوب صورت تھی کہ دیکھنے والے ہکّا بکّا رہ جاتے تھے، وہ بہت

نیک دل، خلیق اور بامروت تھی اور اس میں کچھ ایسی شان تھی کہ وہ کسی شہنشاہ کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

گگویا کے حسن و ادا کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور بڑے سے بڑے گھرانوں کے نوجوان اس کے ساتھ شادی کرنے کی تمنا لیے ہوئے بانس کاٹنے والے کے ہاں پہنچنے لگے، لیکن گگویا نے اپنے منھ بولے باپ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جو شخص اس ارادے سے اُس کے پاس آئے، اس سے کہہ دے کہ گگویا کسی سے شادی نہیں کرے گی، وہ اپنے باپ کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔

ہوتے ہوتے گگویا کے حسن و جمال کی شہرت مکاڈو شہنشاہ جاپان تک پہنچی، اس نے میاکو کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنی لڑکی کو قصرِ شاہی میں بھیج دو۔ گگویا نے جب مکاڈو کے پیام کا حال سنا تو وہ بہت پریشان ہوئی اور اپنے باپ سے رو رو کر کہا کہ میں ہرگز بادشاہ کے محل میں جانا نہیں چاہتی۔ میاکو خود بادشاہ کے پاس گیا اور اس سے عرض کیا کہ "میری لڑکی حضور کے حکم کے مطابق حاضر نہیں ہو سکی، مجھے امید ہے کہ آپ اُسے معاف کر دیں گے۔ وہ کسی طرح شاہی محل میں آنے کے لیے راضی نہیں ہوتی۔"

شہنشاہ نے کہا، "اُسے یہاں آنے کے لیے راضی کرو۔ میں تمھیں اپنے دربار میں بہت اعلیٰ رتبہ پر پہنچا دوں گا۔"

مگر گگویا پر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ اسے خوش رکھنے کے لیے اس کے ماں باپ اور اس کا باغ کافی تھا۔

مگر مکاڈو کے دل میں گگویا کے دیدار کا شوق برابر بڑھتا رہا۔ وہ شکار کے بہانے سے خود میاکو کے ہاں پہنچ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایک ملکوتی حسن و جمال رکھنے والی لڑکی پر پڑی، اس نے لڑکی کو مخاطب کرکے کہا، "میں تمھیں جاپان کے تخت و تاج کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں۔" لڑکی رونے لگی اور کانپتی ہوئی آواز میں اس نے اس عزّت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس کے بعد شہنشاہ نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اس لڑکی کو زبردستی اٹھا کر محل میں پہنچا دو، جیسے ہی مکاڈو کے ملازم آگے بڑھے گگویا نظروں سے غائب ہو گئی۔

مکاڈو خوف سے کانپنے لگا اور بہت عاجزی کے ساتھ اس نے نظروں سے غائب گگویا سے معافی مانگی اور فوراً وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس کے بعد چند سال تک میاکو، اُس کی بیوی اور ان کی متبنّٰی لڑکی بہت اطمینان اور بے فکری کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ آخر ایک دن یکایک گگویا کی طبیعت میں انقلاب سا پیدا ہونے لگا۔ وہ برابر مایوس اور فکرمند سی رہنے لگی اور اکثر بلا کسی ظاہری سبب کے رونے لگتی تھی اور گھنٹوں روتی رہتی تھی۔

یہ حالت دیکھ کر جب اُس کے منھ بولے باپ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کہا، "میرے عزیز باپ! اب وہ وقت قریب آگیا کہ مجھے آپ کو چھوڑ کر جانا پڑے گا اگلے چاند کی چودھویں تاریخ کو ماہتاب کی سرزمین سے لوگ مجھے لینے آئیں گے۔ میرے پیارے باپ! میں چاند کی لڑکی ہوں، مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی تھی اس لیے مجھے یہ سزا دی گئی کہ زمین پر اتار دیا گیا، مگر میری جلاوطنی مجھے راس آئی، میں تمھارے ہاتھ لگ گئی اور مجھے تم سے اور اپنی منھ بولی ماں سے بہت محبت ہوگئی۔ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ تمھیں چھوڑ کر کہیں جاؤں، مگر کیا کروں مجبور ہوں، مجھے جانا پڑے گا۔"

یہ باتیں سن کر میاکو سیدھا مکاڈو کے پاس پہنچا اور اُس سے مدد کی درخواست کی۔ مکاڈو نے اُس کے گھر کی حفاظت کے لیے سپاہی بھیج دیے، لیکن گگویا نے اپنے باپ کو بتا دیا کہ یہ تمام انتظامات بالکل فضول ہیں۔

آخر چاند کی چودھویں رات آگئی اور ماہِ کامل نے اپنی چاندنی سے دنیا کو منوّر کر دیا۔ آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر، آسمان پر ایک بادل نمودار ہوا، وہ برابر نیچے اترتا چلا آیا۔ نورانی چہروں والے کچھ آدمی اس بادل پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سر سے پیر تک روشن اور منوّر تھے اور ایک پینس اُن کے ساتھ تھی جس پر چمکتے ہوئے ریشم کے پردے پڑے تھے۔

مکاڈو کے بھیجے ہوئے سپاہیوں میں سے بہت سے تو خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ دو چار جو باقی رہ گئے، انھوں نے بادل پر کھڑے ہوئے لوگوں پر تیر چلائے، مگر وہ تیر کچھ اثر نہ کر سکے، پینس میاکو کے مکان کے اوپر منڈلانے لگی۔ چند منٹ بعد پینس مکان کے اندر اتر آئی اور ایک آواز آئی، "گگویا آؤ، پینس پر سوار ہو جاؤ، اب زمین پر تمھارے قیام کی مدّت ختم ہوگئی۔"

گگویا اپنے منھ بولے باپ سے چمٹ گئی۔ فوراً ہی اُسے دوبارہ آواز دے کر بلایا گیا۔ اب وہ گریہ وزاری کرتی ہوئی پینس کی طرف چلی، جو لوگ بادل پر آئے تھے، ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر گگویا کو آبِ حیات کا ایک پیالا دیا، اس نے تھوڑا سا پی کر میاکو کو دینا چاہا، مگر ان لوگوں نے ایسا نہ کرنے دیا، وہ ایک دفعہ پھر اپنے منھ بولے ماں باپ سے چمٹ کر رونے لگی، لیکن اب اور تاخیر کا امکان نہ تھا، ان لوگوں نے اسے سہو و نسیان کا چوغا پہنایا اور وہ پینس میں داخل ہوگئی، بادل اوپر اٹھا اور آن کی آن میں آسمان پر پہنچ کر روانہ ہوگیا، گگویا پھر نور کا وجود بن گئی اور زمین کے رہنے والوں کو بھول گئی۔

ان کے مستقبل کا تحفّظ کیجیے

مشرقی اور مغربی پاکستان میں ہماری ۴۱۹ شاخوں میں سے کہیں بھی سیونگ بینک اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے
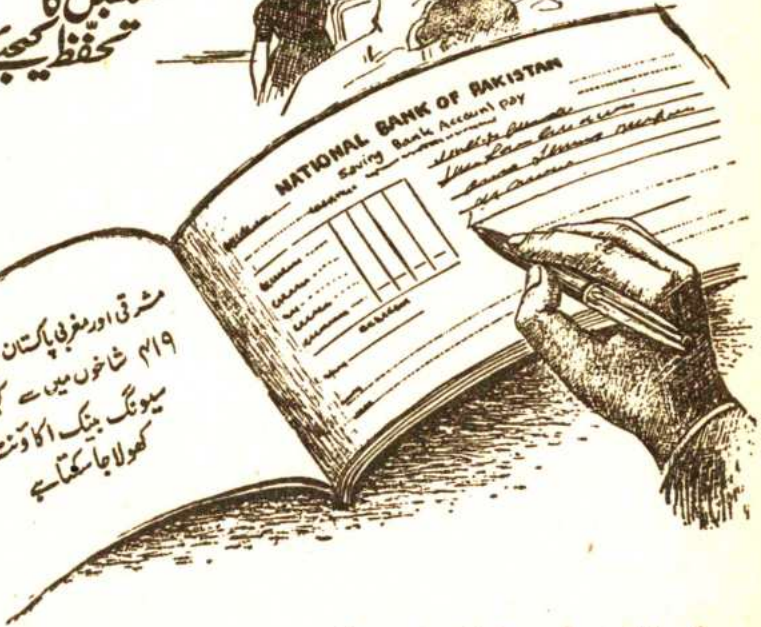
سیونگ اکاؤنٹ پانچ روپے کی قلیل رقم سے کھولا جا سکتا ہے۔ اور بذریعہ چیک روپیہ نکالا بھی جا سکتا ہے۔
آپ کی جمع شدہ رقم پر ۲½ فی صدی منافع بھی ملے گا۔

نیشنل بینک آف پاکستان

قومی ترقی میں معاون

ہیڈ آفس: بالمقابل بولٹن مارکیٹ۔ کراچی

M.G.407/1097 united

بندر اور کچھوا

ایک دن ایک کچھوا ندی کے کنارے دھوپ میں بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دُور ایک کیلے کا درخت ندی میں بہتا آرہا ہے۔ کچھوے نے ندی میں چھلانگ لگائی اور درخت کو کھینچ کر کنارے پر لے آیا، مگر وہ درخت کو باغ تک نہیں لے جا سکا، جہاں وہ اسے لگانا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ایک بندر کو بلایا اور اس سے کہا "میرے ساتھ یہ کیلے کا درخت باغ تک لے چلو۔ وہاں میں اسے اگانا چاہتا ہوں" بندر بولا، "اس کام کے بدلے مجھے بھی درخت کا حصّہ دو گے؟" کچھوے نے کہا، "ضرور!" پھر وہ دونوں درخت کو گھسیٹ کر باغ میں لے گئے۔ کچھوا بولا، "آؤ گڑھا کھود کر اسے زمین میں اگا دیں!" بندر نے کہا "پہلے میرا حصّہ دے دو" کچھوے نے کہا "جب یہ درخت لگ جائے گا اور پھل آئے گا تو ہم آدھا آدھا کرلیں گے" مگر بندر نہ مانا اور کہا کہ میں تو ابھی آدھا درخت لوں گا۔

کچھوے نے ناراض ہوکر کیلے کے درخت کو دو حصّوں میں کاٹ دیا۔ بندر نے ہرے ہرے پتّے دیکھ کر کچھوے سے کہا کہ اوپر کا حصّہ میں لوں گا۔ کچھوے

نے یہ بھی منظور کرلیا، چناں چہ بندر اپنا حصّہ گھر لے گیا اور اسے زمین میں لگا دیا۔ ادھر کچھوے نے بھی اپنا درخت لگا دیا۔ کچھ عرصے بعد اس کے درخت میں ہرے ہرے پتّے نکل آئے اور بہت سے کیلے بھی لگ گئے، مگر بندر والا درخت سوکھ کر گر گیا۔

جب کچھوے کے کیلے تیار ہو گئے تو اس نے انھیں اتارنا چاہا، مگر وہ مجبور تھا، کیوں کہ وہ درخت پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ آخر ہار کر اس نے پھر بندر کو بلایا اور اُس سے کہا، "اگر تم میرے کیلے درخت سے اتار دو تو آدھے تمھارے آدھے میرے۔"

بندر نے یہ شرط منظور کرلی اور جھٹ درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر جاکر اس نے کیلے کھانے شروع کردیے اور کچھوے کو ایک بھی نہیں دیا۔ کچھوا بولا کہ تم خود ہی کیلے کھا رہے ہو، نیچے بھی تو پھینکو، مگر بندر نے صاف انکار کردیا اور مزے لے لے کر کیلے تو خود کھاتا رہا اور چھلکے نیچے پھینکتا گیا۔ اس پر کچھوے کو سخت غصّہ آیا۔ آخر اسے ایک ترکیب سُوجھی۔ وہ دوڑ کر کھیت میں گیا اور بہت سی کانٹے دار جھاڑیاں درخت کے گرد لاکر بچھا دیں۔ جب بندر نے سب کیلے کھا لیے تو اس نے زمین پر چھلانگ لگائی، کانٹے اس کے پاؤں میں گھس گئے اور بندر تکلیف سے کانٹوں پر اچھلنے لگا۔ اِس طرح وہ بہت زخمی ہوا۔ کچھوا بھی قریب کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ بندر کوشش کرکے کچھوے کی طرف لپکا اور غصّے میں اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا اور بولا کہ اب بتاؤ میں تمھیں کیا سزا دوں؟ آیا تمھیں لکڑی سے پیٹوں یا دریا میں پھینک دُوں؟ کچھوے نے بڑی عاجزی سے کہا، "مجھے جو چاہو سزا دو، مگر خدا کے واسطے پانی میں نہ پھینکنا۔"

بندر نے اچھل کر کہا کہ میں تو تمھیں دریا میں ہی پھینکوں گا۔ یہ کہہ کر وہ کچھوے کو اٹھا دریا کے کنارے لے گیا اور گہرے پانی میں پھینک دیا۔

کچھوا زور سے پانی میں گرا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔ اب بندر بہت خوش تھا کہ کچھوا ڈوب گیا، لیکن فوراً ہی کچھوے نے پانی میں سے اپنا سر نکالا اور بندر سے کہا، "دوست تمھارا شکریہ، شاید تمھیں معلوم نہیں کہ میرا گھر پانی میں ہے۔"

نونہال ادیب کے صفحات صرف اُن نونہالوں کے لیے ہیں، جن کو لکھنے کا شوق ہے اور وہ شوق پورا کرنے کے لیے محنت بھی کرتے ہیں۔ جو نونہال دوسروں کی لکھی یا چھپی ہوئی چیزیں ان صفحات میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں، وہ اچھے نونہالوں کا حق چھین لیتے ہیں۔ تمھیں معلوم ہے کہ چوری چھپتی نہیں اور "چور" کی حیثیت سے کون اپنا نام چھپوانا پسند کرے گا۔

محنت کا پھل

خالد سلامت، کراچی

رات کے گیارہ بج چکے تھے، مگر ظفر بدستور پڑھے جا رہا تھا۔ وہ ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا قریب ہی اس کی ماں اور تین بہن بھائی پڑے سو رہے تھے۔ ظفر کے قریب ہی ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی، جس کی روشنی میں وہ بڑی مشکل سے پڑھ رہا تھا۔

ظفر آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ آج کل اس کے امتحان ہو رہے تھے۔ کل اس کا آخری پرچہ تھا۔ اس نے ہر پرچہ بہت محنت اور توجہ سے دیا تھا۔ رات گئے تک وہ پڑھتا رہا پھر سو گیا۔

ظفر کی ماں تو تھی، لیکن باپ جب ظفر چھوٹا سا ہی

تھام گیا تھا۔ اس کی ماں محلے میں چھوٹے موٹے کام کر لیا کرتی تھی، مثلاً آٹا گوندھنا، روٹی پکانا جھاڑو دینا وغیرہ وغیرہ۔ ظفر گھر کے حالات سے واقف تھا۔ وہ اپنی ماں سے کبھی کبھی کچھ پیسے لیتا اور انھیں جمع کر لیتا۔ اسے سینریاں بنانے کا بہت شوق تھا۔ جب اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو جاتے کہ وہ سینریاں بنا سکے تو ایسا سامان لے آتا اور سینریاں بنا کر بازار میں بیچ آتا۔ اس طرح اُن لوگوں کا گزارا ہو رہا تھا۔

ظفر صبح ہی صبح اٹھ گیا اور نماز پڑھ کر پھر پڑھنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر پڑھنے کے بعد اس نے ماں سے ناشتہ مانگا۔ ماں نے جو کچھ روکھی سوکھی اس کے آگے رکھی وہ اس نے شکر سے کھائی اور اسکول چلا گیا۔

ظفر جب امتحان دے کر واپس لوٹا تو پتہ چلا کہ ماں بیمار ہو گئی ہے۔ وہ سوچنے لگا کیا کروں۔ تھوڑی دیر بعد اسے کچھ خیال آیا اور اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے پاس چند سینریاں تھیں وہ انھیں بازار لے گیا۔ وہ آسانی سے بک گئیں۔ اس کے پاس اب اتنے پیسے تھے کہ ماں کے لیے دوا لے آئے۔ اس نے بازار سے دوا خریدی اور گھر پہنچ کر ماں کو دوا دی۔ ظفر جانتا تھا کہ ماں باپ کی خدمت کرنا اولاد پر فرض ہے۔

اس کی ماں تین روز تک بیمار رہی، اس دوران ظفر نے اپنی ماں کو دبایا بھی اور خود ہی گھر کا سارا کام بھی کیا۔

ظفر کو اب اپنے نتیجے کا انتظار تھا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا۔ ظفر کی آنکھ آج ذرا دیر سے کھلی تھی۔ وہ اٹھ کر جلدی جلدی اسکول پہنچا۔ امتحان ہال میں لڑکے بھر رہے تھے۔ ظفر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ پرائمری اسکول کے بعد ہائی اسکول کے نتیجے کے اعلانات بھی شروع ہو گئے تھے۔ آٹھویں جماعت کا بھی نمبر آ گیا۔ ظفر اوّل رہا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ظفر کے لیے سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا۔

ظفر نے جب گھر جا کر ماں کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ خدا انسان کا دل دیکھتا ہے۔ ظفر ہر کام بہت محنت اور نیک دلی سے کیا کرتا تھا۔ محلے والوں کے علاوہ اسکول کا ٹیچر ظفر کو بہت چاہتا۔ ظفر کے دوست تو بس اسی کے پیچھے لگے رہتے۔

ظفر نے ہر جماعت میں بہت محنت کی۔ وہ نویں دسویں اور اب انجینیرنگ پڑھ رہا تھا۔ ظفر نے تین سال کا یہ کورس بھی ختم کر لیا۔ اب وہ ملازم ہو چکا تھا اور جھونپڑی کے بجائے ایک

اچھے مکان میں رہتا تھا۔ اب یہ لوگ بہت خوش حال تھے۔

اس ترقی کی ساری وجوہات کیا تھیں؟ ظفر کی محنت، نیک دلی، خوش اخلاقی، وہ ہمیشہ ہر ایک سے بہت اچھی طرح ملتا۔ ماں کی خدمت کرتا، محنت مشقّت کرتا، یہی ساری وجوہات اس کی ترقی کی تھیں۔ خدا ہم سب کو بھی انھیں باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

چالیس گاؤں

محمد حشیم
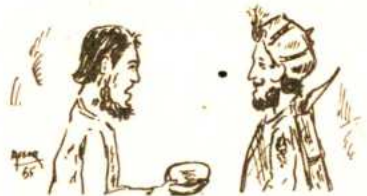
شہنشاہ اکبر کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ مغلیہ خاندان کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اس نے پچاس سال تک ہندستان پر حکومت کی تھی۔ وہ شکار کا بہت شوقین تھا۔

ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے شکار میں ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا اور اس کے پیچھے بھاگتا ہوا اپنے تمام ساتھیوں سے جدا ہو کر بہت دور نکل گیا۔ پیاس کے مارے بادشاہ کا برا حال تھا، حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ یکایک بادشاہ کی نظر ایک چرواہے پر پڑی جو جنگل میں اپنی بکریاں چرا رہا تھا۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر اس سے پانی مانگا۔ چرواہے نے دیکھا کہ کوئی امیر آدمی ہے، جھٹ بکری کا دودھ دوہا اور ایک پیالا بھر کر اکبر کے سامنے لے آیا۔ بادشاہ نے غنیمت جانا اور سارا دودھ پی گیا۔ جب بادشاہ کے ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے چرواہے سے کہا، "تم نے ہم پر بڑی مہربانی کی ہے۔ ہم تمھیں کچھ انعام دینا چاہتے ہیں، کاغذ لاؤ!" چرواہے نے کہا، "حضور میرے پاس کاغذ کہاں اس پتّے پر لکھ دیجیے۔"

اکبر نے پتّا لے کر ایک صوبہ دار کے نام حکم لکھ دیا کہ ہمارے حکم سے اس چرواہے کو چالیس گاؤں دے دیے جائیں۔ چرواہے کو جب یہ معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا اور مارے خوشی کے بہت دیر تک اچھلتا کودتا رہا۔ آخر تھک کر پتّا سرہانے رکھ کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ جلد ہی چرواہے کی ایک بکری وہاں پر آئی اور ہرا پتّا دیکھ کر جلدی جلدی کھانے لگی، فوراً ہی چرواہے کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے بکری کو جو پتّا چباتے دیکھا تو لگا دیوانوں کی طرح چیخنے، "لوگو! میری بکری میرے چالیس گاؤں کھا گئی۔"

جو بھی اس بات کو سنتا ہنستا بھی اور حیران بھی ہوتا کہ بکری چالیس گاؤں کیسے کھا جائے گی۔ آخر یہ بات اکبر بادشاہ تک پہنچ گئی۔ اُس نے فوراً چرواہے کو بلا کر چالیس گاؤں اُسے بخش دیے اور چرواہا خوش خوش گھر چلا گیا۔ اب چرواہے کو بکری چرانے کی ضرورت نہیں تھی اور وہ امیروں کی طرح ہنسی خوشی رہنے لگا۔

بونا کیتلی میں

منصور احمد باجوہ۔ رحیم یار خاں

'مچلو' ایک ننھا سا بونا تھا، جو اپنے باپ کے ساتھ ایک جھیل میں پانی کے نیچے رہا کرتا تھا۔ روزانہ صبح کے وقت اس کا باپ کچلو گھر سے کھانے کی تلاش میں مچلو کو یہ نصیحت کر کے کہ گھر سے باہر نہ نکلنا باہر چلا جاتا۔

ایک دن اپنے باپ کے چلے جانے کے بعد جو مچلو کی طبیعت لہرائی تو وہ چپکے سے گھر کے باہر آ گیا۔ اس کی ماں نے بہتیرا روکا، مگر وہ باز نہ آیا۔ ایک لمحے بعد وہ پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔ کچھ دور اس نے دیکھا کہ ایک سفید بگلا ایک ٹانگ اٹھائے، سر جھکائے کھڑا تھا۔ مچلو کو جو شرارت سوجھی تو چپکے سے اس کے پاس تیرتا ہوا گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جا کر بگلے کو تنگ کرے گا، مگر یہ کیا! بگلا مچلو کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چونچ مار کر اسے جکڑ لیا۔ اب مچلو بگلے کی چونچ میں تھا۔ پہلے تو وہ بہت زیادہ گھبرا گیا۔ موت اسے آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اب تو لگا بگلے کی خوشامدیں کرنے۔ بگلا رحم دل تھا، اسے ترس آ گیا اور اس نے اسے چھوڑ دیا۔ اب مچلو کو نصیحت آ گئی تھی۔ فوراً ہی گھر کو بھاگا، لیکن ایک دم وہ اوپر کی طرف اٹھتا چلا گیا۔ وہ نیچے کو جانا چاہتا تھا، مگر اس کے سامنے ایک لوہے کی دیوار سی تھی۔ اصل میں ایک چھوٹی سی لڑکی نے جو اپنی کیتلی جھیل سے پانی بھر کر اٹھائی۔ تو اس پانی میں مچلو بھی چلا آیا۔

اب مچلو کو احساس ہوا اپنے باپ کی بات نہ ماننے کا۔ اپنے گھر کا خیال کر کے اس کے آنسو نکل آئے۔ بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ چھوٹی سی لڑکی گھر کو بھاگی جا رہی تھی اور مچلو میاں تھے کہ کبھی کیتلی کے ایک سرے پر تو کبھی دوسرے پر۔ سب اگلی پچھلی بھول گئے۔

اس لڑکی نے گھر جا کر کیتلی کو اسی طرح

چولھے پر چڑھا دیا۔ اب تو مچلو کی شامت آگئی۔ ایک سرے سے دوسرے تک بھاگ رہا تھا اور جب پانی ذرا زیادہ گرم ہوگیا۔ تو پھر مچلو چھلانگیں لگانے لگا۔ ننھی لڑکی جو کسی کام سے ادھر آئی۔ تو اس نے دیکھا کہ پانی زور زور سے کیتلی سے باہر اچھل رہا ہے۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ کیتلی میں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر کیتلی میں دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ ایک ننھا سا بونا اس میں اچھل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔ اس نے کیتلی کو آگ سے اتارا اور ہاتھ بڑھا کر مچلو کو اس میں سے نکال لیا۔

"اچھی لڑکی، مجھے میرے گھر پہنچا دو"! مچلو یہ کہتے ہوئے رو پڑا۔

"کہاں ہے تمھارا گھر؟" لڑکی نے متاثر ہو کر پوچھا۔

"اسی جھیل میں جہاں سے پانی بھر کر لائی ہو!" مچلو بولا۔

"نہیں میں تو پنجرے میں بند کر کے رکھوں گی!" لڑکی نے کہا۔ اصل میں اس نے مذاق کیا تھا، مگر مچلو اسے سچ سمجھ کر زار و قطار رونے لگا۔

"نہیں بھئی نہیں، پہنچا دوں گی تمھارے گھر۔ میں نے تو مذاق کیا تھا،" لڑکی نے کہا۔ تب مچلو کی ذرا تسلی ہوئی۔

لڑکی نے اسے اپنی قمیض کے دامن میں چھپا لیا اور بھاگ کر جھیل کے کنارے پہنچ کر مچلو کو چھوڑ دیا۔ مچلو نے جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ ننھی سی رحم دل لڑکی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

مچلو نے اب عہد کیا کہ وہ کبھی باپ کی مرضی کے خلاف نہیں چلے گا۔ اس نے باپ کا کہنا نہ ماننے کی سزا دیکھ لی تھی۔

سہارا

عفت سلطانہ۔ کراچی

ایک غریب گھرانے کی اور دو بہنوں کی کہانی جن کی قسمت ایسی چمکی کہ سب کی چمکے، ایک بے چارا غریب انسان رحیم، جو اپنی بیوی اور اپنی دو معصوم بچیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ دن بھر مزدوری کرتا تھا اور شام کو گھر آکر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کھاتا پیتا تھا۔ ایک شام جب جب وہ اپنے گھر میں کسی گہری سوچ میں بیٹھا تھا کہ ایک دم اُس کے پیٹ میں درد شروع ہوگیا۔

وہ اس طرح تڑپ رہا تھا کہ بیوی بچے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ بیوی بچے سخت پریشان تھے۔ گھر میں ایک کوڑی نہ تھی، جو رحیم کی دوا آتی۔ رات یوں ہی گزر گئی۔ صبح دس بجے رحیم نے اپنی بڑی لڑکی تبسم سے پانی مانگا۔ تبسم بھاگ کر پانی لینے گئی۔ جب اُس نے مٹی کے کٹورے میں پانی بھرا اور واپس مڑی تو اُس کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا گر گیا۔ اور اُ... اُدھر رحیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی وفا دار بیوی اور معصوم بچیوں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ اب رحیم کا جنازہ جاتے سب دیکھ رہے تھے، لیکن اس کی بیوی سے یہ نظارہ نہ دیکھا گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ لوگوں نے اُسے اٹھایا اور ہسپتال لے گئے، لیکن و... وہ بھی تو اس دنیا سے چل بسی تھی۔ وہ بھی ان معصوم بچیوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔

اب ان معصوم بچیوں کا کوئی نہیں تھا۔ ان لڑکیوں کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ تبسم ۱۰ سال کی تھی اور سیما ۸ سال کی۔ اب تو لوگ انھیں حقارت سے دیکھتے تھے۔ کوئی اتنا نہ کرتا کہ ایک وقت کا کھانا کھلا دے۔ لوگ اُنھیں کھانا کھلانے کے بجائے کہتے۔ یہ منحوس ہیں یہ چڑیلیں ہیں، جو اپنے ماں باپ کو کھا گئیں۔ سیما اور تبسم کی بھوک کے مارے جان نکل رہی تھی۔ وہ جگہ جگہ ماری ماری پھرتی رہیں۔

وہ چلتی چلتی ایک جنگل کی طرف نکل گئیں۔ سنسان جنگل میں دو تنہا لڑکیاں بے بس بے سہارا یتیم۔ جو جنگل میں بھٹکتی ہوئی اپنی منزل کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ تبسم کی چھوٹی بہن سیما بیٹھ گئی۔ تبسم نے حیرت سے پوچھا، "کیا ہوا؟ ابھی تو اپنی منزل بہت دور ہے۔ ابھی تو ہمیں بہت تکلیفیں اٹھانی ہیں۔" سیما روتی ہوئی بولی، "باجی۔ باجی، میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اب ان میں ہمت نہیں، جو ایک قدم بھی چل سکوں۔ بھوک کے مارے میری جان نکل رہی ہے۔" تبسم اپنی بہن کی یہ گفتگو نہ سن سکی اور بولی، "میری پیاری بہن میں مجبور ہوں اگر اس وقت تجھے میری جان کی ضرورت ہوتی تو میں دے دیتی۔ اچھا مجھ سے جو ہوگا میں کروں گی۔ تم اس درخت کے نیچے بیٹھ جاؤ۔ میں آگے چلتی ہوں اگر کوئی خدا کا بندہ مل گیا تو تمھارے لیے کچھ کھانے کی چیز مانگوں گی۔" سیما اتنی تھک چکی تھی کہ اگر ایک قدم بھی آگے بڑھتی تو یوں لگتا تھا کہ ابھی گر جائے گی۔ تبسم اپنی بہن کو چھوڑ کر ایک طرف چل دی۔ تبسم کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی، لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کیا بات۔ باجی ابھی تک نہیں آئیں۔ سیما سوچ ہی رہی تھی کہ دور اُسے ایک گھوڑا آتا ہوا نظر آیا۔ اس گھوڑے پر ایک شخص سوار تھا، جو

دیکھنے میں کافی رحم دل معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے سیما کو دیکھتے ہی گھوڑا روک لیا۔ اور سیما کے پاس آکر بولا، "تم کون ہو؟" سیما لرزتی ہوئی آواز میں بولی، "ایک بد نصیب لڑکی"۔ اجنبی بولا، "بیٹا کوئی نام تو ہوگا۔ آخر اکیلی کیا کر رہی ہو؟" سیما نے اجنبی کو بتایا کہ اس کی باجی ابھی آنے والی ہیں۔ اجنبی بولا، "آخر تم ہو کون اور یہاں کیسے پہنچی؟ سیما نے اجنبی کو اپنی درد بھری کہانی سنائی اور رونے لگی۔ اجنبی کو سیما پر بہت رحم آیا اُس نے کہا کہ بیٹا، تم میرے ساتھ چلو۔ سیما نے کہا، "نہیں نہیں۔ میری باجی آتی ہوں گی"۔ اجنبی نے کہا، "بیٹا نہ جانے تمھاری باجی کہاں گئی۔ ہو سکتا ہے اُس کو کسی جانور نے کھالیا ہو"۔ سیما چیخ کر بولی، "خدا کے واسطے ایسا مت کہیے میں باجی کے بغیر کہاں جاؤں گی؟" اجنبی نے سیما کو سہارا دیا اور بولا کہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھاری باجی کو ضرور ڈھونڈوں گا۔ سیما کو تھوڑی تسلی ہوئی اور اجنبی کے ساتھ چلی گئی۔ اجنبی کا نام فیاض تھا۔ اُس کا بھی ایک بارہ سال کا لڑکا تھا۔ جس کا نام صفدر تھا۔ اس کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ لڑکا وقت کا بہت پابند تھا۔ وہ کھیلنے کے وقت کھیلتا اور پڑھنے کے وقت پڑھتا۔ فیاض کو لڑکی کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا کاش میری بھی کوئی بیٹی ہو۔ فیاض نے سیما کو بڑے پیار سے رکھا۔ اُسے اسکول میں داخل کروایا۔ سیما کو بھی صفدر کی طرح پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔

اُدھر تبسّم چلتی چلتی ایک جھونپڑی کے پاس پہنچ گئی۔ اُس جھونپڑی کے آگے ایک بوڑھا آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ تبسّم جلدی سے وہاں پہنچی اور اس آدمی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ جب وہ آدمی نماز پڑھ چکا تو تبسم بولی، "بابا، اگر آپ کے پاس کچھ کھانے کو ہے تو مجھے دے دیجیے، کیوں کہ میری چھوٹی بہن بھوکی یہاں سے بہت دور ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہے"۔ وہ آدمی بولا، "تم ہو کون اور یہاں کیسے آئیں؟" تبسم کا دل بھر آیا۔ وہ بولی، "بابا! میری کہانی بعد میں سننا پہلے مجھے کچھ کھانے کی چیز دیجیے۔ ورنہ میری بہن بھوک سے مر جائے گی"۔ فقیر کو تبسّم پر بہت رحم آیا۔ سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو اپنی چھوٹی بہن سے کتنی محبت ہے۔ فقیر جھونپڑی میں گیا اور کچھ کھانے کا سامان لے کر آیا اور تبسم کے ساتھ چل دیا اور راستے میں تبسّم سے اس کی کہانی کے متعلق پوچھا۔ تبسّم نے اُسے اپنی کہانی سنائی۔ فقیر کو تبسم پر بڑا رحم آیا وہ بولا، "بیٹا آج سے تم میری بیٹی ہو۔ میں سارا دن بھیک مانگتا ہوں۔ میرا بھی ایک لڑکا ہے آج سے یہ تمھارا گھر ہے۔

میرا لڑکا جس کا نام حمید ہے، وہ تمھارا چھوٹا بھائی ہے۔" اتنے میں یہ دونوں اسی جگہ پہنچے جہاں سیما کو تبسم چھوڑ کر گئی تھی، لیکن سیما تو وہاں نہیں تھی۔ تبسم چیخی، "سیما، سیما، سیما!" تبسم باولوں کی طرح اِدھر اُدھر آوازیں لگانے لگی۔ فقیر بولا کہ وہ تو یہاں نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے اُسے کوئی جانور اٹھا کرلے گیا۔ تبسم چیخ کر بولی کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میری پیاری سیما تم کہاں ہو۔ فقیر نے کہا کہ پاگل مت بنو۔ چلو واپس چلیں۔ اگر خدا نے چاہا تو وہ ضرور مل جائے گی۔ تبسم اپنے دل پر پتھر رکھ کر فقیر کے ساتھ چلی گئی۔ اب فقیر حمید اور تبسم ساتھ رہتے تھے۔ فقیر اور حمید دونوں بھیک مانگنے چلے جاتے اور پیچھے تبسم گھر کا کام کرتی رہتی۔ ایک دن تبسم نے سوچا کہ میں ان لوگوں پر بوجھ بن کر رہتی ہوں۔ آخر میں بھی تو کچھ کام کیا کروں۔ یہ سوچنے کے بعد جب فقیر اور حمید گھر آئے تو تبسم بولی کہ باباجی آپ اب بھیک مانگنا چھوڑ دیں، میں اور حمید بھیک مانگا کریں گے۔ فقیر نے کہا کہ مجھے کیا اعتراض ہے۔ دوسرے دن سے تبسم اور حمید بھیک مانگنے جاتے تھے۔ اب ان دونوں کا کام تھا کہ صبح سویرے اٹھ کر بھیک مانگنے جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ تبسم اور حمید دونوں بھیک مانگتے ہوئے ایک کوٹھی کے آگے پہنچے۔ اندر سے ایک لڑکی آئی۔ اُس کے ہاتھ میں دس رُپے کا نوٹ تھا، لیکن وہ باہر نکلی ہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ تبسم نے بھی اُسے دیکھا اور چیخ پڑی، سیما کو اب پورا یقین تھا کہ یہ اس کی پیاری باجی ہی ہے۔ وہ دوڑ کر تبسم سے لپٹ گئی اور خوب روئی۔ حمید بھی اِن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ خوشی کے آنسو۔ حمید اور تبسم کو لے کر سیما اپنے ڈیڈی کے پاس پہنچی۔ وہی رحم دل آدمی فیاض۔ "ڈیڈی دیکھیے میری باجی مل گئیں۔" آج فیاض بہت خوش تھا۔ اُس نے فقیر کو بھی اپنے گھر بلوایا اور اپنے پاس رکھ لیا تبسم کو اور حمید کو اسکول میں داخل کروایا۔ فقیر کے دن پھر گئے تھے۔ وہ کس طرح صرف اتنی سی بات پر کہ اُس نے ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دیا تھا۔ آخر انسان انسان کے کام نہیں آئے گا تو پھر کون آئے گا۔

بی سردی سے شکوہ

ظہور الدین گل۔ ڈیرہ غازی خان

بی سردی سے ہم نے پوچھا
کیا تیرے آنے سے ہے فائدہ؟

کپڑے موٹے ہیں پہنائے
جو نہ پہنے شامت آئے
ہوا جو آئے تو مرتے ہیں
دھوپ بھی نہ ہو تو مرتے ہیں
لائی کمبل، توشک، مفلر
لائی تو کوٹ، رضائی، سوئیٹر
بوجھ یہ اتنا ہم پہ لادا
ہم کو کیا حیوان ہے جانا
تیری ادا ہم کو نہ بھائی
ہاں بی سردی! تو کیوں آئی؟
تجھ سے تو بی گرمی اچھی
سوغاتیں جو لاتی اچھی
تیری طبیعت میں ہے سختی
بات نہ اچھی کوئی سیکھی
سامنے تیرے جو بھی آیا
ایک نہ ایک دکھ اس نے پایا
نزلہ، کھانسی تحفہ تیرا
جس نے بھلے چنگوں کو گھیرا

پاس تیرے بس یہ تحفے ہیں
جن کو لے کر سب روتے ہیں

★

شہزادہ قمر

عبدالستار عادل - گوادر

ملک ایران میں ایک رحم دل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس بادشاہ کا ایک لڑکا تھا، جس کا نام شہزادہ قمر تھا۔ اس کو شکار کا بہت شوق تھا۔

ایک دن شہزادہ قمر چند سپاہیوں کے ہمراہ شکار کھیلنے گیا۔ شکار کھیلتے کھیلتے شہزادے کو ایک خوب صورت ہرنی دکھائی دی۔ شہزادے نے اپنا گھوڑا ہرنی کے پیچھے دوڑایا۔ ہرنی بہت تیز تھی۔ شہزادے نے بھی اپنا گھوڑا تیز کر دیا۔ یہاں تک اپنے ساتھیوں سے بہت دور نکل گیا۔ وہ ہرنی کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ آخر ہرنی ایک غار میں گھس گئی۔ شہزادہ بھی گھوڑے سے اتر کر غار میں داخل ہوا۔ شہزادے نے دیکھا کہ ہرنی ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ جب وہ اُس کے قریب پہنچا تو ہرنی اُس

کے پاؤں چاٹنے لگی۔ شہزادے نے بھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہاتھ میں ایک کیل لگی۔ اس نے وہ کیل اُس کے سر سے نکال لی۔ کیل کے نکلتے ہی ہرنی ایک خوب صورت شہزادی بن گئی، لیکن وہ اندھی تھی۔ اس نے کہا کہ میرا نام شہزادی نرگس ہے۔ میرا باپ ملک بغداد کا بادشاہ ہے۔ مجھے جادوگر شمشام نے اس حالت کو پہنچایا ہے۔ جب تک میری آنکھوں میں آبِ حیات نہ ٹپکایا جائے تب تک میری آنکھیں اصلی حالت میں نہیں آسکتیں اور وہ آبِ حیات جادوگر شمشام کے قبضے میں ہے۔ شہزادے نے کہا، ”میں جادوگر کو مار کر آبِ حیات لاؤں گا۔“ شہزادی نے کہا، ”کیوں اپنی جان مفت میں ضائع کرتے ہو۔ وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔“ شہزادے نے کہا، ”چاہے اس کام میں میری جان بھی چلی جائے۔“

شہزادی نے کہا کہ اس جادوگر کی جان ایک طوطے میں ہے۔ تم یہاں سے شمال کی جانب چلے جاؤ۔ پانچویں دن تمھیں ایک دریا دکھائی دے گا۔ وہاں تمھیں ایک چھوٹی سی کشتی دکھائی دے گی۔ تم کشتی میں سوار ہو کر دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ جانا۔ وہاں سے سات میل دور تمھیں ایک پہاڑ دکھائی دے گا۔ اس کی چوٹی پر ایک پنجرے میں طوطا بند ہوگا۔ تم اس طوطے کو مار کر پہاڑ کے پیچھے سے آبِ حیات آسانی سے حاصل کرسکوگے۔ شہزادے نے یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے شہزادی کو ایک محفوظ جگہ پر بٹھادیا۔ شہزادے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ پانچویں دن شہزادہ ایک دریا کے پاس پہنچا تو اس نے وہاں کشتی دیکھی۔ شہزادہ نے کشتی میں بیٹھ کر چپوؤں کے ذریعے کشتی چلانی شروع کی۔ دریا کو پار کرنے کے بعد اس نے پیدل چلنا شروع کیا آخر پہاڑ تک پہنچ گیا۔ اُس نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا اور وہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک حبشی تلوار لیے کھڑا ہے اور پنجرہ اس کے سامنے ایک درخت کی شاخ میں لٹک رہا ہے۔ شہزادے نے فوراً اپنی تلوار نکال لی اور وہ حبشی سے لڑنے لگا۔ آدھے گھنٹے کی لڑائی کے بعد شہزادے نے اس کو ٹھکانے لگادیا۔ شہزادے نے طوطے کو پنجرے سے نکال کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ اور شیشی میں آبِ حیات بھر کر شہزادی کے پاس پہنچایا۔ اس نے اس کی دونوں آنکھوں میں آبِ حیات ٹپکادیا جس سے اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ شہزادہ اُس کو لے کر اپنے ملک پہنچا۔ بادشاہ کو اپنی سرگزشت سنائی۔ بادشاہ بیٹے کی بہادری سن کر بہت خوش ہوا۔ اور دونوں کی شادی کردی۔

چور کی سزا

سید ضیاء الرحمٰن ضیا - پٹنہ

رات کے دو بجے تھے - رات بالکل سنسان اور تاریک تھی - دن بھر کے تھکے ماندے لوگ بے خبر سو رہے تھے - وحید خاں اور ان کی بیوی کو بھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا -

اچانک دھم کی آواز سُنائی دی ، جیسے کوئی کود پڑا ہو - اسی آواز نے وحید خاں کی بیوی کو جاگنے پر مجبور کر دیا - ان کی بیوی نے ایسا محسوس کیا جیسے باہر کی گلی سے دیوار پھاند کر کوئی آنگن میں کود گیا ہو -

" اٹھیے اٹھیے ! نہ معلوم آنگن میں دھم کی آواز کیسی سُنائی دی ! " وحید خاں کو ان کی بیوی نے جگاتے ہوئے کہا -

" اونھ ہوں ! کیا مصیبت ہے - کوئی بلی وغیرہ کودی ہوگی " وحید خاں نے کروٹ بدلتے ہوئے دلاسہ دیا -

" ذرا سنیے تو ؟ کوئی پیر دباتا ہوا آہستہ آہستہ اندر کی طرف آ رہا ہے "

اب وحید خاں کو مکمل یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو کوئی چور ہی ہے - انھوں نے دروازے کی دراڑ سے جھانکا اور ارے با . . . . با . . . با . . . . پ کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے - انھوں نے ایک سایہ اندھیرے میں اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا -

وحید خاں تھے تو پٹھان ، لیکن ان کی بزدلی کا چرچا سارے محلے میں تھا - ان کے برعکس ان کی بیوی نہایت ہی عقل مند اور نڈر تھیں - ہاں تو چور کا سایہ دیکھتے ہی ان کا سارا جسم پسینے سے تر ہو گیا - بدن تھر تھر کانپنے لگا اور چہرے پر حیرانی و پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے -

بیوی نے ان کو سہارا دیا اور کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے اور دھیرے سے ایک ترکیب وحید خاں کو بتائی :

چور ، جو کہ بڑھتا ہوا ان کے کمرے تک چلا آیا تھا - ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اور یہ سننے کے لیے کان کھڑے کر دیے کہ کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے -

لیکن یکایک چور کے کان میں وحید خاں کی بیوی کی صدا آنے لگی -

وحید خاں کی بیوی ذرا غصیلی اور

زور دار آواز میں بول رہی تھیں: "آپ کے جیسا بھی کوئی بے وقوف نہ ہوگا ۔ کہ رات کو زیور کی گٹھری آنگن والے درخت پر لٹکا دیتے ہیں ۔ اتنا ڈریئے گا تو پھر اس دنیا میں رہنا بے کار ہے ۔ اگر کسی بدمعاش کو پتہ چل جائے تو سارے زیور سے ہاتھ دھونا پڑے گا ۔ اسی زیور کی وجہ سے میری نیند بھی خراب ہوگئی ہے ۔ خدا نہ کرے آپ جیسا کوئی بدعقل دنیا میں ہو۔"

"کم بخت نہ خود سوتی ہے ، نہ مجھے سونے دیتی ہے ۔ بڑی عقل مند بنتی ہے ۔ اگر کوئی چور چھپا ہوگا تو تیری کڑاکی آواز نہ سن لے گا ؟ پھر زیور لے جائے گا تو مجھے دوش نہ دینا ۔" وحید خاں نے ذرا بگڑنے کے انداز میں کہا ۔

" اجی آپ تو ناحق غصہ ہو گئے ، چھوڑیے ان باتوں کو ، لیکن اتنا کہے دیتی ہوں کہ کل سے میں اپنے سارے زیور اپنے بکس میں رکھوں گی ۔ چلیے اب سو بھی رہیے ۔" اس طرح اپنی گفتگو ختم کر کے دونوں میاں بیوی خاموش ہوگئے ۔

قریب آدھا گھنٹہ تک چور اپنی جگہ پر چپ چاپ کھڑا رہا ۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اب سو گئے تو وہ دبے قدم آنگن کی جانب روانہ ہوگیا ۔ آنگن میں پہنچتے ہی اس نے درخت کے اوپر نظر دوڑائی ۔ واقعی اسے ایک کالی گٹھری ڈال میں لٹکی ہوئی دکھائی دی ۔ اب کیا تھا خوشی کے عالم میں وہ جھٹ درخت پر چڑھ گیا اور فوراً دونوں ہاتھوں سے اس کالی گٹھری کو دبوچ لیا ۔

گٹھری میں ہاتھ لگنا تھا کہ سارے جسم میں شہد کی مکھیاں لپٹ گئیں اور اس بری طرح کاٹ کھایا کہ حضرت چور پیڑ سے کود پڑے اور جسم کو نوچتے ہوئے وہاں سے رفو چکر ہو گئے ، کیوں کہ جسے گٹھری سمجھ کر اس نے پکڑا تھا ، دراصل وہ شہد کی مکھیوں کا چھتہ تھا ۔

برازیل

برازیل جنوبی امریکا کا سب سے بڑا ملک ہے ۔ تقریباً آدھے براعظم میں پھیلا ہوا ہے ۔ برازیل کا علاقہ پاکستان سے نوگنا زیادہ ہے ، لیکن آبادی کے لحاظ سے کم ۔ اتنے بڑے خطۂ زمین میں تقریباً سات کروڑ انسان آباد

ہیں۔ برازیل کے زیادہ حصّے میں ایک وسیع میدان پھیلتا چلا گیا ہے۔ صرف مشرقی ساحل کے پاس کا کچھ علاقہ کوہستانی ہو۔ اس میدان کے ایک بڑے حصّے میں ایمزن کے خطّے کے گھنے جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سے ذرا اور جنوب کی طرف چلیے تو گھاس کا خطّہ نظر آتا ہے۔ برازیل کا صدر مقام ریوڈیزو ہے، جو برازیل کا سب سے بڑا شہر ہے۔ دائیں طرف پانی نظر آتا ہے، جو بحرِ اوقیانوس کا ہے، جس کی موجیں ریوڈے ژیزو کے قدموں میں لوٹ رہی ہیں۔ اس سے ذرا اوپر پہاڑوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ ریوڈ ژینرو کا شمار بہترین بندرگاہوں میں ہوتا ہے۔ اس شہر کو پروان چڑھانے میں بندرگاہ کا ایک حد تک کافی حصّہ ہے۔ یہاں جہازوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کوہستانی علاقے سے جو ندیاں نکلتی ہیں، ان سے شہروں کو کافی فائدہ ہوتا ہو۔ ان ندیوں کو آبشار کے ذریعے گرا کر بجلی پیدا کی جاتی ہے، جو شہر میں پہنچائی جاتی ہے۔ قدرت نے برازیل کے ساحلی علاقے کو زراعت کے لیے بہت موزوں بنایا ہے۔ یہاں بارش کافی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے یہاں جنگلی پیڑ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، کیوں کہ ساحلی علاقے کے آس پاس پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ سمندر سے جو بخارات بھری ہوائیں اٹھتی ہیں، وہ پہاڑ روک لیتے ہیں۔ اس وجہ سے اس پہاڑی علاقے میں قرب وجوار کے پست میدانوں میں اتنی گرمی نہیں پڑتی جتنی کہ ساحلی میدان میں۔ آس پاس کے علاقوں میں کھیتی باڑی کی جاسکتی ہے۔ ریوڈے ژینرو کے بعد ساؤن پاڈلو کا نمبر آتا ہے۔ یہ آبادی جنوب مغرب میں آباد ہے۔ ساؤن پاڈلے کے آس پاس کا علاقہ قدرت نے بہت زرخیز بنایا ہے۔ ایمزن، جو دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے، کوہستان اینڈیز سے نکلتا ہے۔ اس کے منبع سے بحرالکاہل کا ساحل زیادہ سے زیادہ ایک سو میل دور ہے۔ یہ دریا براعظم کو سیراب کرتا ہے۔ دریائے ایمزن بحرِ اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ اگر ایمزن کے کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرا کنارہ دیکھیں تو بہ مشکل نظر آئے گا۔ جب یہ دریا بحرِ اوقیانوس میں گرتا ہے تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ سَو میل تک پانی کی رنگت بدل جاتی ہے۔ ایمزن کے زیادہ حصّے میں جنگلات کھڑے ہیں، جو کوسوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور قدرت نے ان کو حسن و خوبی سے نوازا ہے۔ کافی عرصے سے مشرقی ساحل کے علاقے کا زیادہ تر حصّہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ معلوم نہیں یہ بلا وہاں کس طرح ناگہاں آگئی۔

آدم خور کا شکار

گرمی کا زمانہ تھا، اندھیری راتیں تھیں، جس کی وجہ سے ہم مجبوراً باہر سوتے تھے۔ ایک رات کو ایک سایہ نمودار ہوا اور ایک ساتھی غائب ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ دوسری رات کی بات ہے کہ تمام ساتھی بیدار تھے کہ اچانک وہی سایہ پھر نمودار ہوا۔ تمام ساتھی کھڑے ہوگئے۔ سامنے آدم خور کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ یہ دیکھتے ہی سب کے اوسان خطا ہوگئے اور لوگ گھروں کی طرف بھاگ پڑے۔ آدم خور قریب آتا جاتا تھا اور ہمارا زمین سے پیر بھی نہیں ڈگمگاتا تھا۔ اچانک گولی کی آواز آئی۔ آدم خور پر تین گولیاں ماریں، مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی اور وہ جنگل کی طرف بھاگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے غائب ہوگیا۔ صبح ہوتے ہی ہم بندوقوں سے لیس ہوکر جنگل کی جانب نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں خون کے قطرے ملے، جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ ان ہی گولیوں کا خون ہے، جو رات کو آدم خور پر چلائی گئی تھیں۔ قطروں سے ہمیں راستے میں آسانی ہوگئی۔ قطروں کے نشانات دور تک دکھائی دیتے تھے، جن کی وجہ سے ہم آدم خور تک پہنچ گئے۔ سامنے کچھ جھاڑیاں اور غار تھے۔ بائیں جانب دور تک نشیبی علاقہ نظر آتا تھا۔ دور جاکر ایک غار نظر آیا۔ یہاں پر کافی خون پڑا تھا۔ اکثر جانوروں اور آدمیوں کی کھوپڑیاں بھی تھیں۔ میرے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ ہم کسی چٹان کے پیچھے چھپ جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آدم خور یہاں رہتا ہو۔ آخر کار ہم ایک پہاڑی کی آغوش میں چھپ گئے اور آدم خور کا انتظار کرنے لگے۔ اچانک میرے ایک ساتھی نے بتلایا کہ جھاڑیوں میں کچھ کھڑکھڑاہٹ ہورہی ہے۔ میں نے دیکھا تو واقعی کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ ہم انتظار کرنے لگے کہ شاید یہ وہی آدم خور ہو، جو گزشتہ رات آیا تھا۔ آدم خور قریب آتا جارہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ غار کی طرف چل دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ مسٹر رائٹ نے کہا کہ اب تیار ہوجاؤ۔ ہم نے رائفلیں نکال لیں اور اس پر ایک وقت ہی میں حملہ کردیا۔ ہماری گولیاں اس کے جسم کے حصّوں میں پیوست ہوگئیں۔ لیکن وہ دور تک بھاگتا چلا گیا اور سامنے غار غار میں جاکر گر پڑا اور اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اور بار بار چکر کھاکر گر جاتا تھا۔ ہمارے پاس کھانے

کا تمام سامان ختم ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے ہم کو اور پریشان ہونا پڑا۔ ہم نے اپنے ایک ساتھی کو بھیجا کہ وہ جائے اور شہر سے کچھ کھانے کی چیز لے آئے۔ وہ وہاں سے روانہ ہوا اور بغیر کسی چیز کے دیکھے اسی سمت نکل گیا اور آدم خور کا نوالہ بن گیا۔ جیسے ہی وہ چٹان سے اترا، اس کو آدم خور نے دیکھا اور وہ اس کی سمت بھاگا۔ اس کو دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے اور بے تحاشا بھاگتا رہا۔ آخر کار ایک جگہ جا کر گر گیا اور آدم خور نے اس کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے صاف کر گیا۔ اس کی وجہ سے ہم کو بہت رنج ہوا۔ اب ہم آدم خور کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پریشانی کے عالم میں ایک جھاڑی میں گھس گیا اور لیٹ کر سو گیا۔ ہم نے یہ موقع غنیمت جانا اور بالکل آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گئے اور ایک چٹان کے قریب چھپ گئے۔ سب نے ایک ساتھ وار کیا۔ اچانک ایک دو گولی اس کے دماغ میں پیوست ہو گئی۔ وہ چکرا کر گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ نہ معلوم اس نے کتنے بے گناہ کو مارا تھا۔ آج اس کا بدلہ مل گیا۔

اللہ تعالیٰ کیا کھاتا ہے؟

عبدُالعظیم اعظمیؔ۔ اعظم گڑھ

ہم مکتبِ اوّل میں تھے۔ ایک روز ہمارے ایک استاد نے، جنھیں ہم منشی جی کہا کرتے، سوال کیا کہ بتاؤ بچّو! اللہ تعالیٰ کیا کھاتا ہے؟ ہر بچّہ سوچنے لگا کہ آخر اللہ تعالیٰ کیا کھاتا ہے! خاموشی چھا گئی۔ منشی جی نے کہا "کچھ تو کہو بچّو!" تب ہمارے ساتھیوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق بتانا شروع کیا۔ کسی نے کہا "اللہ تعالیٰ تو اچھے اچھے میوے کھاتا ہوگا"۔ کسی نے کہا "اللہ میاں دودھ ملائی کھاتے ہوں گے"۔ کسی نے کہا "وہ مزے دار مٹھائیاں کھاتا ہوگا"۔ غرض ہر بچّے نے جس کی سمجھ میں جو آیا بتایا اور منشی جی ہر جواب پر "نہیں" کہتے رہے۔ آخر میں انھوں نے کہا "یہ سب سرے سے غلط ہے"۔ ہم شوق اور توجہ کی نگاہوں سے منشی جی کو تکنے لگے۔ تب انھوں نے قدرے توقف کے بعد فرمایا "اللہ تعالیٰ کچھ نہیں کھاتا، وہ تو دوسروں کو کھلاتا ہے۔ سوچو، جو خود کھانے کی فکر میں رہے گا اور جو خود محتاج ہوگا، وہ دوسروں کو کیا کھلائے گا۔ وہ تو انسانی صفات سے بالاتر ہے..."

عزیز الرحمٰن ۔ بنوں

س : اگر میں انگریزی سے ترجمہ کرکے کہانیاں، مضمون بھیجوں تو؟

ج : تم بھیجو تو۔

مرزا محمد مشتاق ۔ سیال کوٹ

س : آپ نے اپنے رسالے کا نام ہمدرد نونہال کیوں رکھا ہے؟

ج : نونہالوں کے ہمدرد کا نام اور کیا ہو سکتا ہے۔

نجم العارفین ۔ ڈھاکہ

س : ایک لفافہ میں کتنی چیزیں بھیجی جا سکتی ہیں؟

ج : ایک لفافہ میں تم چاہو جتنی چیزیں بھیج سکتے ہو، مگر ہر چیز الگ کاغذ پر لکھو اور ہر چیز پر نام و پتہ پورا لکھو۔

گوہر علی گوہر ۔ کراچی

س : اگر میں قسط وار کہانی نونہال میں شائع کرانا چاہوں تو کیا وہ شائع ہو جائے گی؟

ج : قسط وار کہانیاں وہی شائع کی جاتی ہیں، جو بہت ہی اچھی ہوں۔

سعید احمد کریمی ۔ ٹھٹھہ

س : بھائی جان جلدی سے بتایئے کہ ہم چاند پر کب تک پہنچ جائیں گے؟

ج : ذرا چاند پر پہلے آدمی کو پہنچ جانے دو، اس سے پوچھ کر بتاؤں گا۔

ہمایوں بشیر احمد ۔ کپتائی

س : دنیا میں سب سے بڑا پل کہاں ہے؟

ج : دنیا کا سب سے بڑا پل آسٹریلیا میں ہے جس کا نام سڈنی ہاربر برج ہے۔

غزالہ تبسم ـــــ کراچی

س : بھیا نونہال میں کہانی یا نظم شائع کرانے سے پہلے نونہال کا ممبر بننا ضروری ہے؟

ج : ضروری تو نہیں، لیکن خریدار بن جانا اچھا ہی ہوتا ہے۔

منوّر اختر ـــــ لائل پور

س : بھیا میں اپنے بھائی کا فوٹو شائع کرانا چاہتا ہوں، اب آپ بتائیے کہ فوٹو کاپی بھیجوں یا نگیٹیو؟

ج : نہیں تم صرف فوٹو بھیج دو اگر اچھا ہوا تو شائع کر دیں گے۔

زاہد حسن مجیدی ۔ جے پور

س : ٹائی از دی سائن آف جنٹل مین، واٹ از دی سائن آف جنٹل لیڈی؟

ج : کیا اپنی قومی زبان اُردو نہیں آتی؟

عتیق الرحمٰن ـــــ ڈھاکہ

س : دنیا کی سب سے بڑی مچھلی کا نام تو بتائیے؟

ج : دنیا میں سب سے بڑی مچھلی وھیل مچھلی ہوتی ہے۔

مرزا مبشر احمد ۔ ربوہ

س : ڈاک کا ٹکٹ کب ایجاد ہوا؟

ج : مئی ۱۸۴۰ء میں

سیف اللہ خاں ۔ جلال پور بھٹیاں

س : مئی، جون، جولائی کے شمارے میں نونہال کی قیمت سالانہ چار رُپے اور اگست، ستمبر، اکتوبر میں سالانہ قیمت آٹھ رپے لکھی ہوئی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

ج : اگست سے ہم نے تمھارے نونہال کو اور اچھا بنا دیا، یعنی اس کے صفحات بڑھا دیے اور چھپائی دو رنگی کر دی، اس لیے اس کی قیمت بھی بڑھا دی ہے۔

عبدالستار عادل ۔ گوادر

س : ہمدرد نونہال کس سن میں جاری ہوا؟

ج : ۱۹۵۳ء میں

ظہور الحق شمسی ۔ پیلی بھیت

س : بھائی جان میں نونہال جاری کرانا چاہتا ہوں بتائیے کیا صورت ہوگی؟

ج : اپنے کسی دوست کو پاکستان میں لکھ دو کہ وہ ہمیں آٹھ رُپے کا منی آرڈر کر دے، پھر ایک سال کے لیے نونہال بھی جاری کر دیں اور ایک کتاب "وسط ایشیا کی سیاحت" بھی تمھیں انعام میں بھیج دیں گے۔
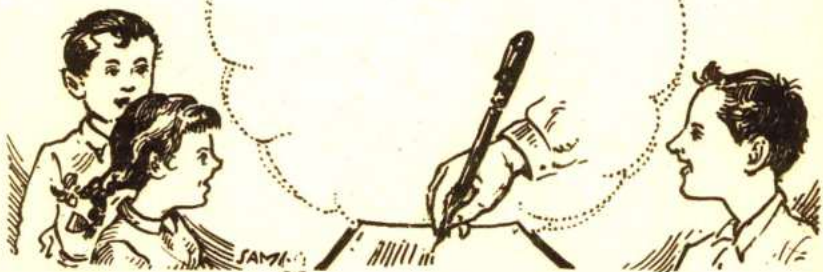
میرے خیالات

نومبر کا ماہنامہ تو اپنی خصوصیات میں کوئی کمی نہیں رکھتا، لیکن ابھی تک نہ تو آپ نے میری کچھ تجاویز پر عمل کیا اور نہ اس کے متعلق نونہالانِ وطن نے ابھی تک کوئی رائے دی۔ مجھے بہت سخت افسوس ہے اور جب تک رہے گا جب تک میری تجاویز پر آپ عمل نہ کریں گے۔

اس رسالے میں سب سے بڑی دولت، بچوں کی ریلی، نک چڑھی بلی، پُراسرار غار، تیسرے جہاز کے بعد، ذرا دیکھنا میری دم ہل رہی ہے، بہادر سلو اور ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہانیاں اور مضمون "چیزیں کس طرح تیرتی اور ڈوبتی ہیں" ابوالقاسم الزہراوی وغیرہ بہت اچھے ہیں۔ کارٹون، ٹیڈی نہیں ٹڈی اور نونہال مصور پسند آیا۔

آخر میں امید کرتا ہوں کہ پچھلی تجاویز پر غور کیا جائے گا اور رسالہ کے ۱۱۲ صفحات میں کچھ اسلامی اجزا بھی شامل کریں گے۔

سید محمد غیاث الدین۔ لاہور

لاجواب رسالہ

نومبر کا "ہمدرد نونہال" پڑھا۔ پڑھنے کے بعد بے ساختہ منہ سے نکل پڑا کہ یہ ایک لاجواب رسالہ ہے۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔

نظم "پہیلی" بہت پسند آئی اور واقعی بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔

"نونہال ادیب" کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اسے جاری رکھیں، کیوں کہ اس طرح بچوں کو کہانیاں اور

مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

کہانی " ایسا بھی ہوتا ہے" بہت دل چسپ تھی۔ نونہال مصوّر خوب مصوّری کرتے ہیں۔ رنگین صفحات رسالے کی خوب صورتی کو دو بالا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ "پُراسرار غار" اور " بلغاریہ کے بچّے" معلوماتی مضامین تھے۔ ہماری معلومات میں اضافے کے لیے آئندہ بھی آپ ایسے مضامین شائع کرتے رہا کریں۔ میری رائے ہے کہ اگر آپ ہمارے لیے مضمون نویسی کا سلسلہ شروع کر دیں تو یہ بہت بہتر ہوگا۔

ویسے اب تو " ہمدرد نونہال" نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس کی تعریف کے لیے اب تو الفاظ ہی نہیں ملتے۔ یہ سب آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مرزا محمد مشتاق احمد۔ سیالکوٹ

بہت ہی پیارا

اس دفعہ کا " ہمدرد نونہال" پڑھا، بہت ہی پیارا تھا۔ چوم لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ خدا کرے اس رسالہ کو دن دُگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

شمیم اختر۔ جہلم شہر

اخبار نونہال

نومبر کا " ہمدرد نونہال" پڑھا، اس دفعہ تو آپ نے کمال کر دیا۔ اتنا حسین سرورق دیکھ کر خواہ مخواہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔

اخبار نونہال میں بڑی دل چسپی سے پڑھتا ہوں کیوں کہ اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نظم "شکایت" بڑی پسند آئی اور دوسرے مضامین میں سے پُراسرار غار، ابوالقاسم الزہراوی، سب سے بڑی دولت، بڑی پسند آئی ہیں۔ میری طرف سے وحیدہ نسیم کو بڑی بڑی مبارک باد دیں۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں آج اس ملک میں ہماری ہمشیران میں بھی ایک اعلا درجے کی مصنّف ہیں۔

منظور احمد ظفر۔ لائل پور

ترتیب

ہمدرد نونہال شمارہ نومبر ۱۹۶۴ء ملا۔ سرورق کی جتنی تعریف کی جائے تھوڑی ہے۔ میں رسالے کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

رسالے میں مختلف حصّے ہوں۔ جن کی ترتیب اس طرح ہو:۔

۱۔ کہانیاں
۲۔ سائنس
۳۔ جغرافیہ
۴۔ نظمیں
۵۔ مصوّری
۶۔ شکاریات
۷۔ حیرت انگیز واقعات
۸۔ ننھے ادیب۔
۹۔ مزاح
۱۰۔ بڑی شخصیتوں سے انٹرویو
۱۱۔ اسلامی موجد و حکمراں
۱۲۔ مسکراہٹیں
۱۳۔ پاکستان کی ترقی۔ مختلف اداروں اور پاکستان کی زراعتی ترقی، ایک مستقل سلسلہ
۱۴۔ قسط وار مضامین
۱۵۔ اور دوسرے قسط وار مضامین

میں چاہتا ہوں کہ جہاں بڑوں کے لیے ڈائجسٹ اور دوسرے رسالے نکلتے ہیں، ایسے ہی ہم بچّوں کے لیے بھی نکلیں۔ اگر آپ رسالے کے لیے چکنا کاغذ استعمال کریں تو رسالہ کو چار چاند لگ جائیں گے۔

ایم۔ اے۔ کمال۔ کراچی

شکایت

اس دفعہ پرچے میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف اور پیاری چیز نظم "شکایت" تھی۔ بار بار پڑھی۔ بہت پسند آئی۔ اگر وحیدہ نسیم جیسی ہستیاں اس پرچے میں حصّہ لینے لگیں تو اس کی عظمت کو چار چاند لگ جائیں۔ ٹائیٹل تو خیر ہر دفعہ ہی شاندار ہوتا ہے، اس کی تعریف کیا لکھوں۔ کہانیوں میں "پُراسرار غار"، "تیسرے جہاز کے بعد" اور "نک چڑھی بلّی" اچھی تھیں۔ اگر ترقی کی یہی رفتار رہی تو ایک دن "ہمدرد نونہال" بچّوں کے تمام پرچوں پر چھا جائے گا آپ کے معلوماتی مضامین مجھے بہت پسند ہیں۔

اسلم صدیقی۔ ٹیکسلا

اخبار نونہال

میں کافی عرصے سے آپ کا قابلِ تعریف رسالہ ہمدرد نونہال پڑھ رہا ہوں واقعی یہ ہمارا ہمدرد ہے۔ سب مضامین اچھے ہوتے ہیں، لیکن سب سے قابلِ تعریف چیز اخبار نونہال ہے۔ اس سے ہم لوگوں کو بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ نونہال میں کوئی سلسلہ وار کہانی چھاپیں۔ نومبر کے رسالہ میں کہانی "پراسرار غار" اور نظم "شکایت" اچھی لگیں۔ سرورق بھی قابلِ تعریف تھا۔ میں امتیاز ایوب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

محمد پرویز خاں۔ کوئٹہ

نونہالوں کی خدمت

نومبر کا ہمدرد نونہال پڑھا۔ حکیم محمد سعید صاحب قوم کے نونہالوں کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے لیے وہ قابلِ ستائش ہیں۔ اب ہمدرد نونہال تعریف کا محتاج نہیں رہا۔ ہمدرد نونہال کا ہر مضمون ہمارے لیے مشعلِ راہ اور "قارون کے خزانہ" سے کم نہیں۔ اگر پاکستان کا ہر بچّہ "ہمدرد نونہال" پڑھنا شروع کر دے تو کچھ ہی عرصے میں ہر بچّہ علم کی روشنی سے فیض یاب ہو جائے گا۔ میں حکیم محمد سعید صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ "ہمدرد نونہال" کو پاکستان کے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں پہنچا دیں۔

یوسف گوڈیل شفا۔ کراچی

لطیفے

ماہ نومبر کا "نونہال" نظر سے گزرا۔ ٹائیٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مجموعی طور پر ساری کہانیاں عمدہ تھیں۔ اگر اس میں لطائف کے ایک صفحے کا اور اضافہ کر دیا جائے تو اس رسالے میں چار چاند لگ جائیں گے۔

گوہر علی گوہر۔ کراچی

جاگو جگاؤ

مشرقی پاکستان جیسی سر زمین پر نونہال کو دیکھ کر از حد مسرت ہوئی۔ یوں بھی اچھے پرچے کا اس علاقہ میں فقدان ہے۔ کبھی کبھی جب نونہال جیسا پرچہ نظر آجاتا ہے تو کتنی مسرت ہوتی ہے بتا نہیں سکتا۔ اتنی مختصر قیمت پر "اردو ڈائجسٹ" کے مانند صوری معیار کے پرچہ کا جاری کرنا ایک بلند حوصلے اور مستحکم عزم کا آئینہ ہے۔ نہ جانے مبارک بادیوں کی کتنی تحریریں اب تک آپ وصول کر چکے ہوں گے، لیکن پھر بھی میری طرف سے اس کے اجرا پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

"نونہال" صوری اور معنوی لحاظ سے معیاری ہے۔ اس کے معلوماتی دلچسپ اور سائنسی مضامین بھی کچھ کم دل چسپ، جاذب ذہن اور تاثراتی نہیں۔ اب کا (حال کے شمارے کا) "جاگو جگاؤ" مختصر مگر بڑا ہی جامع ہے۔

شمیم اختر۔ میمن سنگھ

اتالیق

آپ کا دسمبر کا رسالہ آیا دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دسمبر کا رسالہ ملتے ہی دل خوشی کے جذبات سے لبریز ہو گیا جب ٹائیٹل دیکھا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ہمدرد نونہال علمی، ادبی، دینی لحاظ سے واقعی تمام پاکستانی بچوں کا اتالیق ہے۔ دسمبر کا رسالہ چڑیا اور انشاء اللہ، ہر چیز اینٹوں سے مل کر بنی ہے، راجا کی نیت، بہت پسند آئے۔ میری طرف سے ان کے تحریر کرنے والوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کر دیجیے۔

ماجد علی۔ مدرو سندھ

الفاظ نہ ملے

اس شمارے میں یعنی دسمبر کے شمارے میں، ابو سمبل کا مندر، کہانیوں میں کھو گیا دس رُپے کا نوٹ، زمین کی پیدائش، لڑکا چیتا اور لڑکی پسند آئے۔ اخبار نونہال ترقی پر ہے، یہ اچھا ہو تا کہ آپ اس میں کوئی ادبی معما شروع کر دیں۔ تعریف کے الفاظ نہیں ملتے، نہیں تو بیان کرتا۔ میرے سب دوستوں نے اسے بہت پسند کیا ہے۔ آپ اس میں لطیفے بھی شائع کیا کریں۔

شیخ مقبول احمد فیاض۔ میانوالی

مشعل راہ

دسمبر کا شمارہ نظر سے گزرا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ اس شمارے کی سرورق کہانی، "ایٹم کس چیز سے بنے ہیں" بہت پسند آئی، کہانیوں میں "پہاڑی ہٹاؤ"، "لڑکا چیتا اور لڑکی" بہت پسند آئی۔ نظم، "میں کسان" بہت عمدہ تھی۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند ہے یہ رسالہ بچوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

سعید فیاض۔ کراچی

محمد جنید - مظفر نگر

عمر: ۱۲ سال — تعلیم: ششم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔ قلمی دوستی۔ والی بال کھیلنا

پتہ: معرفت احمد سعید ڈاکخانہ سیکری ضلع مظفر نگر (یوپی۔ انڈیا)

علی محمد گوڈیل - کراچی

عمر: ۱۸ سال — تعلیم: دہم

دل چسپیاں: حلقۂ احباب وسیع کرنا۔ مضمون نگاری

پتہ: باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز۔ منگھو پیر روڈ۔ کراچی ۱۶

سید احمد غزالی - لاڑکانہ

عمر: ۱۰ سال — تعلیم: ششم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ ٹکٹ جمع کرنا۔ ہمدرد نونہال پڑھنا۔

پتہ: معرفت سید تفضل حسین ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج۔ لاڑکانہ

سید محمد علی - شہداد پور

عمر: ۱۳ سال — تعلیم: ششم

دل چسپیاں: نماز پڑھنا، ہمدرد نونہال پڑھنا

پتہ: محلہ ہرداس پورہ۔ شہداد پور

اشفاق احمد - کراچی

عمر: ۱۶ سال — تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ مطالعہ کرنا

پتہ: ۵/۱۸ ولایت آباد۔ منگھو پیر روڈ۔ کراچی ۱۶

سید شریف - شہداد پور

عمر: ۱۲ سال — تعلیم: پنجم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ کہانیاں پڑھنا

پتہ: مولوی سید شہاب الدین۔ دائرہ مہدویہ۔ شہداد پور

شہنشاہ حلیم - علی گڑھ

عمر: ۱۸ سال تعلیم: بی۔ اے

دل چسپیاں: کیرم کھیلنا۔ ہمدرد نونہال کا مطالعہ۔

پتہ: معرفت "بال سدھار کلب" محلہ پھپالہ۔ علی گڑھ (انڈیا)

اشرف علی خاں حیرت - کراچی

عمر: ۱۴ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: ہمدرد نونہال کا مطالعہ کرنا۔ سائیکل چلانا

پتہ: آر۔ ۸۱ کورنگی ٹاؤن شپ۔ کراچی

سیّد محمود - شہداد پور

عمر: ۱۰ سال تعلیم: چہارم

دل چسپیاں: تصویریں بنانا۔ قلمی دوستی

پتہ: معرفت مولانا سیّد شہاب الدین دائرہ مہدویہ۔ شہداد پور

افتخار حسین شیخ - لاہور

عمر: ۱۸ سال تعلیم: سیکنڈ ائیر

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ اخبار بینی۔ شاعری

پتہ: سجاد منزل ۶۴۳ انچ چوہٹہ مفتی باقر۔ اندرون اکبر گیٹ لاہور

فیروز علی - حیدرآباد

عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ ہمدرد نونہال پڑھنا۔

پتہ: اللہ والا سیمنٹ ڈپو۔ پرنس علی روڈ۔ حیدرآباد

محمد زماں خاں درّانی - ماتھلہ

عمر: ۱۱ سال تعلیم: پنجم

دل چسپیاں: قرآن پڑھنا۔ نماز پڑھنا۔ بڑوں کا ادب کرنا۔

پتہ: محمد زماں خاں درّانی۔ خانپور تعلقہ میرپور۔ ماتھلہ، سکھر

صداقت علی منور - منٹگمری

عمر: ۱۷ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: رسائل و اخبار پڑھنا۔

پتہ: سی۔ ایم۔ آر ہائی اسکول۔ اوکاڑہ۔ منٹگمری

محمد سلیم واحدی - ڈھاکہ

عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ رسائل کا مطالعہ

پتہ: معرفت واحد صاحب بریلوی، ۴۷ بڑا کٹرا (چوک) ڈھاکہ ۱

شوکت حسین - اوستہ محمد

عمر: ۱۳ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: مضمون نگاری۔ ناول پڑھنا

پتہ: شوکت حسین جماعت نہم گورنمنٹ ہائی اسکول اوستہ محمد جیکب آباد

ایم عبدالوہاب صدیقی - سیالکوٹ

عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ رسائل پڑھنا

پتہ: بڈھی بازار محلہ وڈیریاں ۳۵/۸۴ سیالکوٹ شہر

شاہدہ خاتون - کراچی

عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: رسائل پڑھنا، کشیدہ کاری، پینٹنگ

پتہ: معرفت محمد تقی صاحب چانولہ، ۳۹۷ سی بلاک سنٹرل کمرشل ایریا طارق روڈ پی ای سی ایچ ایس

محمد جاوید واحدی - ڈھاکہ

عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی - ادبی رسائل پڑھنا

پتہ: معرفت واحد صاحب بریلوی، ۳ بڑا کٹرا (چوک)، ڈھاکہ ۱

سید ثاقب الحسنین - منٹگمری

عمر: ۱۰ سال تعلیم: پنجم

دل چسپیاں: رسالے پڑھنا - سائنس کی کتابوں کا مطالعہ

پتہ: گورنمنٹ پرائمری اسکول - فیض پور - ڈاکخانہ بائل گنج - منٹگمری

محمد پرویز واحدی - ڈھاکہ

عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: کہانیاں لکھنا - رسائل پڑھنا

پتہ: معرفت واحد صاحب بریلوی، ۳ بڑا کٹرا (چوک)، ڈھاکہ ۱

قاضی محمد شاہد صدیقی - حیدرآباد

عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی - رسائل پڑھنا

پتہ: گنج بخش شاہ کا پڑ ۶، ای/۲ حیدرآباد

محمد صدیق - کراچی

عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا - اخبار پڑھنا

پتہ: سیکنڈ فلور - صالح منزل مچی میانی روڈ - کھارادر - کراچی

محمد ادریس صابر - راولپنڈی

عمر: ۱۷ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی - اخبار پڑھنا

پتہ: کوہ نور کالونی ہائی اسکول - دہم - راولپنڈی

ریاض بیگم - جہلم

عمر: ۱۴ سال تعلیم: پنجم

دل چسپیاں: اردو شوق سے پڑھنا - مختلف کھیل کھیلنا

پتہ: چوہدری محمد رمضان محلہ زبیر - خاص کریالہ - چکوال - جہلم

محمد رفیق - کراچی

عمر: ۱۴ سال - تعلیم: نہم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا - شاعری کرنا

پتہ: تھرڈ فلور - سراج مینشن کھوڑی گارڈن گلی نمبر ۳ - کراچی

راج بیگم - جہلم

عمر: ۱۴ سال تعلیم: سوم

دل چسپیاں: بچوں کے رسالے پڑھنا

پتہ: چوہدری محمد رمضان محلہ زبیر - خاص کریالہ - چکوال - جہلم

ممتاز قریشی - ڈھاکہ

عمر: ۱۱ سال تعلیم: پنجم

دل چسپیاں: رسالے پڑھنا - بچوں کا پروگرام سننا۔

پتہ: ۱۱ - ایش دتا روڈ - بخشی بازار - ڈھاکہ

غلام احمد - جہلم

عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی

پتہ: چوہدری مرزا خاں محلہ زبیر - خاص کریالہ - چکوال - جہلم۔

امتیاز اطہر صدیقی - کراچی

عمر: ۱۰ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: کرکٹ - فٹبال کھیلنا - ٹکٹ جمع کرنا

پتہ: معرفت اے ڈی صدیقی F ۱۸ گذری روڈ پی اینڈ ٹی کالونی کراچی

ریاست علی ہمدرد - اسماعیل آباد

عمر: ۱۴ سال　تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی - کہانی لکھنا - مصوری

پتہ: کالونی ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ اسماعیل آباد بلاک ۱۲ کوارٹر ۱ -

ناصر خاں - کراچی

عمر: ۱۱ سال　تعلیم: ششم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا - ٹکٹ جمع کرنا

پتہ: کہکشاں VII ڈی ۱/۴/۱ ناظم آباد - کراچی ۱۸

افتخار احمد - لاہور

عمر: ۱۷ سال　تعلیم: ایف اے

دل چسپیاں: قلمی دوستی - رسالے پڑھنا

پتہ: ۲۶ - غازی آباد سانده روڈ - لاہور

محمد انور کوکاٹے - بمبئی

عمر: ۱۶ سال　تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی - ٹکٹ جمع کرنا

پتہ: نمبر ۵ نیو کاضی اسٹریٹ - تیسری منزل بمبئی ۳ (انڈیا)

خالد لطیف بھٹی - گوجرانوالہ

عمر: ۱۸ سال　تعلیم: آر-ٹی-ای

دل چسپیاں: قلمی دوستی - ٹکٹ جمع کرنا -

پتہ: اسلام آباد اسٹریٹ ۱ گوجرانوالہ

امجد اقبال خاں - لاہور

عمر: ۷ سال　تعلیم: دوئم

دل چسپیاں: لکھنا - پڑھنا - کھیلنا

پتہ: معرفت محمد ایوب خاں نظامی کریم اسٹریٹ عبدالکریم روڈ گوجر سنگھ لاہور

. . . .

فارم حلقۂ دوستی

نام . . . .

عمر . . . .

تعلیم . . . .

دل چسپیاں . . . .

پتہ . . . .

. . . .

ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

اطراف : سمت، کنارے (طرف کی جمع)
افراط : زیادتی، کثرت
انحصار: کسی سے گھر جانا، کسی پر موقوف ہونا
انعام اکرام: بخشش، کسی بات کا صلہ
اَن گنت: بہت سے، لاتعداد، بے شمار
بدنما : بدشکل، دیکھنے میں بُرا معلوم ہونے والا
براق : چمکیلا، نہایت سفید، تیز چلنے والا
بن : جنگل
پائدار : مضبوط، دیر تک رہنے والی چیز
پُرفضا : بارونق، کشادہ
پختہ : سخت، مضبوط، پکّا
تتّربتّر : پریشان، الگ الگ، بے ترتیب
تخلیہ : تنہائی، خالی کرنا یا ہونا
تسکین : آرام، دلاسا، افاقہ
توفیق : ہدایت، خدا کا فضل، خدا کی مہربانی
ٹھوس : بھاری، سخت
جبر : ظلم، دباؤ
جواہر : جوہر کی جمع، قیمتی پتھر
خراش : رگڑ
خوش نما: دل چسپ، خوش منظر

درشت: کھردرا، سخت
درگت : پتلا حال، بری گت
سنجیدہ: جچا ہوا، مہذب
سنگریزے: پتھر کے ٹکڑے، (سنگ ریزہ کی جمع)
شفّاف : نہایت صاف، جس میں دونوں طرف سے نظر آئے
شگاف: چیرا، جھری
عنصر : اصل، بنیاد
قصبات: گاؤں سے بڑی اور شہر سے چھوٹی جگہ (قصبہ کی جمع)
کارواں: قافلہ
کھوسٹ : بہت بوڑھا یا پرانا
لگائی بجھائی: لڑائی جھگڑا کرانا، اِدھر کی بات اُدھر کہنا
متانت : زبان کا بے ہودہ الفاظ اور خیالات سے پاک ہونا۔
معطر : خوش بودار، عطر میں بسا ہوا
موگری : وہ آلہ جس سے ز[illegible]تے ہیں، کپڑے دھونے کا ڈنڈا
مہارت: مشق، قابلیت، لیاقت
نجات : رہائی، چھٹکارا
وارے نیارے: بڑا نفع
وجود : ظاہر ہونا، جسم، بدن
ہلچل : بے قراری، گھبراہٹ
ہم جولی: ہم عمر جو ساتھ کھیلا ہو

جیبی ٹارچ

(سرورق ص۲ کا بقیہ حصہ)

جو زیادہ گرمی پانے سے پگھل جاتا ہے۔

خاکہ (ج) چھوٹے فیوزوں کو ظاہر کرتا ہے۔ گھر میں کمروں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی ہے، یہ فیوز بھی اُتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر کہیں تار مل جائیں تو صرف اسی کمرے میں اندھیرا ہو، باقی کمروں میں کرنٹ جاری رہے۔ فیوز کے تاروں کو چینی مٹی کے ٹکڑوں پر لگایا جاتا ہے۔ مٹی حاجز ہوتی ہے۔ زیادہ بار پڑنے پر تار پگھل جاتا ہے اور کرنٹ بند ہو جاتی ہے۔

خاکے (د) میں شورٹ سرکٹ کا شعلہ دکھایا گیا ہے یعنی جب مثبت و منفی تار آپس میں مل جاتے ہیں تو شعلہ پیدا ہوتا ہے جو خطرناک ہوتا ہے۔ کرنٹ لمبا راستہ طے کرنے کی بجائے اسی جگہ ایک تار سے دوسرے تار پر آجاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ عمل شورٹ سرکٹ کہلاتا ہے۔

خاکے (ھ) میں ایک سوئچ ظاہر کیا گیا ہے جس سے کرنٹ جاری بھی کی جاسکتی ہے اور روکی بھی جاسکتی ہے۔

خاکے (و) میں ایک بلب دکھایا گیا ہے جس میں ٹنگسٹن کا باریک تار محفوظ ہے۔ بلب میں عام طور پر آرگون گیس کی تھوڑی سی مقدار بھر دی جاتی ہے تاکہ تار جلد خراب نہ ہو۔

خاکے (ز) میں کیبل یا موٹے تار کا سرا کاٹ کر دکھایا گیا ہے۔ اس میں ایک کی بجائے تانبے کے کئی تار ہوتے ہیں جنھیں بل دے کر ایک کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں زیادہ لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ تار پر ربر یا پلاسٹک کا حاجز غلاف چڑھا ہوتا ہے۔

جنوری ۱۹۶۵ء

رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳

پہلا شمارہ

ہمدرد
نونہال

بارھویں جلد

اس رسالے میں کیا ہے؟

قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے ——— سالانہ آٹھ رُپے

PRINTED AT ZAIN PACKAGING INDUSTRIES LTD